ناشر: سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف کلچر اینڈ لینگویجز

مطبع: فوٹو لیتھو ورکس۔ دہلی

کتابت: غلام نبی کول۔ غلام حسن

تعداد: ۵۰۰

قیمت:

ترتیب

پیش لفظ

شخصیات نمبر کی دوسری جلد پیش خدمت ہے۔ اس جلد میں بھی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ایسی شخصیات کو جگہ دی گئی ہے جنہوں نے ہمارے ادب، علوم وفنون اور ثقافت کو فروغ دینے میں مقدور بھر حصہ ادا کیا ہے۔ ان میں سے کچھ کا تعلق ماضی قریب سے ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں سے واقعات تیزی سے اُترتے جارہے ہیں۔ اگر صحیح واقعات بروقت درج ہوں تو اس سے آنیوالے زمانے کے قاری کے لئے ریکارڈ درُست رہے گا۔

کسی شخصیت کی تشکیل میں جو عناصر کارفرما ہوتے ہیں ان میں اس کے خاندان، تعلیم اور ماحول کو نمایاں، بلکہ کلیدی، حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسکا قالب نسل وخاندان کی مٹی سے بنتا ہے۔ اس کے عادات، خصائل، طورطریقوں ــــ غرض سبھی میں اس کے خاندان کا براہ راست ہاتھ یا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے افکار وعقائد کا تانا بانا بھی دور یا نزدیک، کہیں نہ کہیں اس کے خاندان، تعلیم اور اس کے گرد وپیش سے ملتا ہے۔ دنیا کے اس وسیع وعریض سٹیج پہ کوئی کتنے ہی بڑے

کارنامے انجام کیوں نہ دے لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ وہ انسان ہے فرشتہ نہیں۔ اس کی زندگی میں خوبیاں چاہے زیادہ ہی ہوں لیکن کمزوریاں بھی ضرور ہوں گی۔

ہم نے اس جلد کے لئے ریاست کے تینوں خطوں سے اہلِ قلم حضرات سے تینس ۳۰ شخصیات پر مضامین لکھنے کی درخواست کی تھی۔ یہ درخواست ایسے لوگوں سے کی گئی تھی جن کا ان شخصیات سے کسی نہ کسی مرحلے پر تعلق یا دلچسپی رہی ہو۔ لیکن ہمیں سبھی مضامین نہیں ملے۔ اس لئے اس بار بھی کچھ لوگوں سے ایک کے بجائے دو دو مضامین لکھوائے گئے تاکہ یہ جلد بروقت شائع ہو جائے۔ ہم نے پچھلے سال کی طرح اس سال بھی تصاویر حاصل کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ہم سبھی تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہمیں اُمید ہے کہ قارئین اس جلد کے بارے میں بھی ہمیں اپنی قیمتی آراء سے مستفید فرمائیں گے۔

سری نگر۔ ۷، فروری ۸۷ء —— محمد احمد اندرابی

محمد یوسف ٹینگ

لارنس صاحبؒ

"وہ لوگ سب سے زیادہ خوش رہتے ہیں جو اپنے لوگوں کے لئے کچھ کرتے ہیں لیکن میں تو آہستہ آہستہ کشمیریوں کو اپنے ہی لوگ سمجھنے لگا ہوں۔"

(سر والٹر لارنس)

کشمیر کے حوالے سے اُن شخصیات کو خوب اُچھالا جاتا ہے جو اس کے پہاڑوں کی بانہہ جھٹک کر میدانوں میں پہونچے اور وہاں شہرت و دولت کے آسمان پر چمکے۔ نہرو، اقبال، سعادت حسن منٹو اور بیسیوں دوسرے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ ٹریفک دو طرفہ رہا ہے۔ کچھ ممتاز شخصیات ایسی بھی ہیں جنہیں کشمیر کی وابستگی سے ہی تواریخ میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ یہ نہیں کہ انہوں نے مطلق حیثیت میں اہم کارنامے انجام نہیں دیئے لیکن یہ ضرور ہے کہ کشمیر کے اُفق نے اُن کی شخصیت کو خاص انفرادیت بخشی۔ کشمیر شومت کے عظیم شارح ابھنوگپت کو لیجئے اس کی جڑیں گوڈ (بنگال) میں تھیں لیکن وہ کشمیر میں اپنی فکری کاوش سرانجام نہ دیتا تو اس کی چمک دمک اس قدر خیرہ کن نہ ہوتی۔ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کی تصانیف اور علمی کارنامے بے شمار ہیں لیکن معروضی (objective) تواریخ

اُنہیں خاص طور کشمیر کی نسبت سے ہی یاد کرتی رہے گی۔ یقین نہ ہو تو انسائیکلوپیڈیا
اسلام، مشاہیر صوفیا یا اقبال کے جاوید نامہ میں اُن کا ذکر دیکھئے۔ اُن کا دامن
دولت کشمیر میں اسلام کے طلوع کا مشرق بن چکا ہے اور اُن کو بہرحال کشمیر کے حوالے
اور حکایت سے پہچانا جائے گا۔ اس معزز صف میں سر والٹر روپر لارنس کا بہت
ہی ممتاز نام بھی شامل ہے۔ وہ اگرچہ کسی مذہبی اعتقاد کی پوشاک پہن کر سامنے
نہیں آئے لیکن مستقبل کا باشعور کشمیری اُن کی کشمیر نوازی اور کشمیر شناسی کو بہت اعلیٰ
مقام دیگا۔ جہاں تک سر والٹر کی اپنی ذات کا تعلق ہے وہ دانستہ طور اپنے آپ کو کشمیر
کی وساطت سے پہچاننے پر اصرار کرتے ہیں۔ اُن کے نام اور کام کو اُن کے وطن انگلستان
کے لوگ فراموش کر چکے ہیں (اس دعویٰ کی دلیل آگے آجائے گی) لیکن وہ کشمیر کو زبانی
یاد ہیں اور آیندہ اُن کے متعلق کشمیری کہیں گے ؎

یاد رکھو مجھے سبق کی طرح

چنانچہ اس دردمند اور دانشمند انگریز کو بھی کشمیر کی نسبت سے ہی تاریخ کے حافظے
میں جگہ ملنا شروع ہو گئی ہے۔

لارنس صاحب کا نام میں نے اپنے چھٹپن میں ہی سُنا۔ بات یوں ہوئی کہ میرے
والد مرحوم نے جنہیں انسانی عجوبے جمع کرنے کا شوق تھا ایک بالشتیے کو اپنے گھر میں
ڈال رکھا تھا۔ احمد اللہ نام کا یہ چھوٹے قد کا آدمی دیکھنے میں بڑی خشم ناک آنکھوں
کا تھا اور وہ عام طور پر بات کرنے والے بچوں پر گویا ٹوٹ پڑتا تھا۔ اُس کے چہرے
پر بال نہیں اُگتے تھے (کشمیر میں ایسے آدمی کو کھوسہ کہتے ہیں)۔ وہ صرف کھاتا پیتا
تھا اور اُس کا شاید ایک ہی کام تھا والد صاحب کی ٹانگیں دبانا۔ لیکن اس موم کے
پتلے میں جلتی ہوئی موم بتی کی طرح اُس وقت فتیلہ لگ جاتا تھا جب والد کا کوئی
بڑا مہمان آجاتا۔ والد صاحب اُس کا تعارف کراتے ہوئے کہتے "اس نے لارنس صاحب

کی آنکھیں دیکھی ہیں۔" اتنا سُننا ہوتا کہ احمد اللہ بالشتیے کے چہرے کی جھریاں گویا سٹیم اسنری سے ہٹ جاتیں۔ اُس کی سخت آنکھوں میں مسکان کھلنے لگتی اور اُس کے چہرے پر فخر کی لالی پیدا ہو جاتی۔ اور پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار۔ وہ لارن صاحب کے متعلق طرح طرح کے سوالات اور جرح کا جواب دینے لگتا جیسے وہ باتیں کل کی ہوں۔ احمد اللہ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک صدی سے کہیں زیادہ عمر پا کر مرا لیکن وہ موت کے دن کی صبح تک لارن صاحب کے تذکرے سے باز نہیں آیا۔ ایک احمد اللہ پر ہی کیا موقوف۔ شوپیان کے سارے علاقے میں سروالٹر کی دیومالا چھائی ہوئی تھی۔ وہ کس طرح گرمی کے زمانے میں آتے جب کسان کھیت میں "ہند باتھ" گا رہے ہوتے اور پھر کسی مینڈھ پر بیٹھ کر اُنہیں تال سم دینے کے لئے تالی بجاتے۔ اسی طرح وہ کس طرح ہر کھیت کی مٹی مُنہ میں ڈال کر چوستے تھے اور پھر پیش گوئی کرتے کہ اس کے ایک ترک رقبے میں کتنی دھان اُگے گی۔ ظاہر ہے کہ اس میں بہت حد تک حُسنِ ظن اور مُبالغہ تھا لیکن بقول جارج برنارڈ شا مبالغہ تو سچ کی ہی ایک تیز و طرار صورت ہے*۔ چنانچہ اس سچ کی بازگشت نے وادیٔ کشمیر کے دیہات میں آج تک گونج پیدا کر رہی ہے۔ کشمیریوں کے اجتماعی حافظے نے والٹر لارنس کو لارن صاحب بنا کر اپنے عقیدت کے نگارخانے میں سجا لیا ہے۔ سرینگر میں ایس پی کالج کے ساتھ محکمہ مال کے محافظ خانے میں اطالوی مرمر سے بنا ہوا اُس کا جو مجسمہ (BUST) اس صدی کی تیسری دہائی میں ممنونیت کے احساس کے تحت نصب کیا گیا ہے اُس کی ایک زیادہ خوبصورت نقل کشمیریوں کے دل میں موجود ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ اُس کی بہت ہی معیاری و دلآویز کتاب

---

*۔ جارج برنارڈ کا مقولہ ہے: " EXAGERETION IS A TRUTH WHICH HAS LOST ITS TEMPER

"ویلی آف کشمیر" کو جو کشمیری جب بھی پڑھیگا وہ لارنس صاحب کو اپنا دوست ہی کہیگا، اپنے کنبے کا ایک ایسا رکن تصور کرے گا جس کے ساتھ ہر پیسہ بھی کھایا جا سکتا ہے اور گلہ بھی گائی جا سکتی ہے۔

جب میں والٹر روپر لارنس کی تلاش میں نکلا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اُس کے وطن نے تقریباً اسے فراموش کر دیا ہے۔ اگر سرینگر کے محافظ خانے میں اُس کی مورتی نہ ہوتی تو ہم اُس کی شکل و صورت کا اندازہ بھی نہ کر سکتے۔ جب میں نے اُس کے حالات کے لئے نئی دہلی کی برٹش کونسل کو خط لکھا تو مجھے اس کے چیف لائبریرین جی اے اوانز نے اپنے خط ق۔ 2/50/Del مورخہ ۹ ستمبر 1969ء کے ذریعے اطلاع دی:

"میں نے اپنے لندن کے دفتر کو لکھا۔ پھر جب میں خود لندن گیا تو میں نے اس دفتر میں جا کر سر والٹر کی تصویر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ کہیں سے بھی تصویر کی ایک نقل حاصل کریں۔ میں نے اب سُنا ہے کہ سر والٹر یا اُس کی قبر کی کوئی تصویر حاصل کرنے کی کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ ہم اس بارے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

بعد میں مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں لارنس صاحب کی آخری کتاب "THE INDIA WE SERVED" کے پبلشرز M/s Cassel & Co. Ltd لندن سے رجوع کر لوں۔ میرے استفسار پر اس فرم نے اپنے لندن کے دفتر RED LION SQUARE LONDON W.C.I سے اسسٹنٹ ٹو لٹریری ڈائریکٹر جے۔ ایم سلاڈن کے دستخطوں سے مجھے لکھا:

"آپ کے خط کا شکریہ۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی سر والٹر لارنس سے متعلق استفسار کے بارے میں مدد نہیں کر سکتے۔ ہمارے اکثر ریکارڈ اور آرکائیوز

سنہ ۱۹۴۱ء کی بمباری (BLITZ) کے دوران تلف ہو گئے۔"

لے دے کے بات "ٹائمز" لندن میں شائع شدہ سر والٹر کے وفات نامے (OBITUARY) اور "ڈکشنری آف نیشنل بیوگرافی" میں اُس کے مختصر سوانحی نوٹ تک محدود رہ گئی۔ لیکن انگریز بہر حال انگریز ہیں۔ اتنا بھی بہت غنیمت ہے۔ ہم مشرقی ہوتے تو سارے استفسار کا جواب اقبالؔ کے اس مصرعہ میں ہی مل جاتا ع

اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

"ٹائمز" لندن کے ۲۷ مئی سنہ ۱۹۴۰ء کے شمارے میں ٹیمپلے ریڈر کے لارنس کے وفات نامے سے چند اقتباسات:

"سر والٹر لارنس سپنجر وار کو ووکنگ میں اپنے فرزند کے گھر میں انتقال کر گئے۔ وہ ایک لایق آدمی تھے جنہوں نے اپنی طویل اور ممتاز سرکاری زندگی میں بہت سے اہم عہدوں پر کامیابی امتیاز کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ انڈین سول سروس میں انہوں نے ریاست کشمیر کے سٹیلمنٹ کمشنر کی حیثیت سے بہ طور خاص اپنا لوہا منوایا اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کے سلسلے میں واپس انگلستان نہ آتے تو وہ ایک ہندوستانی صوبے کے سربراہ بن جاتے۔ اُن کے پرانے دوست (لارڈ) جارج کرزن (وائسرائے ہند) مقرر ہونے کے بعد اُنہیں اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت اپنے ساتھ واپس ہندوستان لایا۔ وہ قلم کارانہ صلاحیتوں سے آراستہ تھے جو اکثر آدمیوں کے برعکس سرکاری فائلوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جانے کی بجائے (اس کے باوجود) نکھر آئیں۔ کشمیر سیٹلمنٹ سے کہیں بعد اُنہیں اگر اپنے ہمہ جہت کاموں میں سے کسی سے تھوڑی سی تسکین حاصل ہو جاتی تو وہ "ٹائمز" میں کئی برس تک ہندوستان

میں اپنے تجربات سے متعلق سلسلہ ہائے مضامین لکھنے سے اور ہمارے اس موضوع سے
متعلق کسی نے مدت تک سر والٹر سے زیادہ بہتر مضامین نہیں لکھے۔

والٹر روپر لارنس ۹ر فروری ۱۸۵۷ء کو موریٹین کورٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ جی لارنس
کے چھٹے بیٹے تھے۔ انہوں نے ۱۸۷۷ء میں انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا۔ وہ ۱۸۸۹ء
میں کشمیر کے سیٹلمنٹ کمشنر بنے جہاں انہوں نے مالیات کا ایک بڑا صحت مند ڈھانچہ کھڑا
کیا۔ ریاست میں سات سال ٹھہرنے کا نتیجہ "دی ویلی آف کشمیر" ۱۸۹۵ء کی تحریر کی صورت
میں نکلا۔ یہ کشمیر پر معیاری کتاب ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب INDIA WE SERVED
میں لکھا کہ انہیں اگر کشمیر میں اپنے کام کے بعد کسی اور بات سے فرصت ملی ہے تو وہ "ٹائمز"
لندن کی کالم نگاری ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شایع ہوئی۔

کشمیر کے ساتھ لارنس کا معاملہ پہلی نظر میں عشق LOVE AT FIRST SIGHT
کا سا تھا۔ لگتا ہے کہ اس کے ضمیر میں کشمیر کی کوئی آواز جنم سے ہی لرز رہی تھی۔ جب وہ
انگریز راج کے خوبصورت گہوارے شملہ میں مقیم تھا جہاں مال روڈ کی چہل پہل، والٹر یگل
راج کی چمک دمک کے علاوہ رقص گاہوں کی تھرکتی تانوں پر نیلی آنکھوں والی نوجوان
میموں کے قدم لہراتے تھے۔ کشمیر آنا کوئی دل کو لگتی ہوئی دعوت نہیں تھی۔ اُدھر اُسے
وزارت خارجہ اور حیدر آباد کی ریذیڈنسی کے بلاوے بھی آرہے تھے۔ پہاڑوں اور پردوں
میں چھپے ہوئے کشمیر کی صدا پر آنا کوئی دانشمندی نہ تھی۔ اُسے اپنے دوستوں نے بتایا:

"تم لقمے کی تلاش میں کشمیر جارہے ہو تو جاؤ لیکن تم وہاں کوئی کام کرنا چاہتے ہو
تو تمہیں دکھ ہی ہاتھ آئے گا۔"

"تم کشمیر میں ایک خوشگوار مہمان نہ بن سکوگے۔"

"کشمیر جاتے ہو تو وہاں کی حکومت کا مقرر کردہ باورچی قبول نہ کرنا۔"
(ظاہر ہے کیوں؟ ایسے ہی مشکوک حالات میں اس سے پہلے کشمیر لوگوں کے ایک اور محسن

HE DIED FOR رابرٹ تھارپ کو چلتا کر دیا گیا جس کی قبر پہ شیخ باغ سرینگر میں
KASHMIR کا پُراسرار کتبہ موجود ہے اور جس کا "فردِ جرم" "KASHMIR MIS-
GOVERNMENT" نام کی کتاب کی صورت میں چیخ رہا ہے)۔ لیکن لارنس گویا کسی
SLEEP WALKER کی طرح ایک اندرونی طلب پر جا رہا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"دوستوں نے مجھے انتباہ دیا کہ پہاڑوں کے اُن بادلوں، جن کے پیچھے خوبصورت وادی پوشیدہ ہے، میں آنکھوں سے بھی اُتر جاؤنگا اور دل سے بھی محو ہو جاؤں گا۔ میں اگرچہ اُس ملک کے حالات سے ناواقف تھا لیکن صرف کشمیر کے نام سے ہی میں اسقدر فریفتہ ہو گیا کہ مجبور ہو کر وہاں کا رُخ اختیار کر لیا۔"

اور پھر:

"ہر چہ بادا باد.... میں آخر کار کشمیر ہاں کشمیر جا رہا تھا۔"

(THE INDIA WE SERVED)

لارنس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اُس سے پہلے ۱۸۸۷ء میں انڈین سول سروس کا ایک بڑا افسر اے، ونگیٹ بھی کشمیر آیا تھا اور اُس کا کام بھی بندوبستِ اراضی تھا لیکن اُس کے خلاف یہاں کے مفادِ خصوصی نے جن میں استحصال کرنے والا شہر باش طبقہ اور دربار کے جگادری تھے، وہ بستره گول کر کے کسی طرح اپنی جان بچا کر لے جانے میں کامیاب ہوا۔ لارنس ایک مشنری کی طرح آیا لیکن اُسے جلد ہی ستی سر میں موجود شارک مچھلیوں نے چھلنی کرنا شروع کر دیا۔ اُس وقت تک مہاراجوں کے بے درد کارندے سزاوُل، شقدار اور دوسرے ہرکاروں کی فوج کے ساتھ کشمیری کاشتکاروں کا جگر نوچ رہے تھے۔ بقول لارنس ۱۸۸۹ء میں صرف کشمیر میں مالیہ وصول کرنے کے لئے آٹھ ہزار کے قریب کیل کانٹے سے لیس پیا یک بردار مامور تھے جو صرف حکومت کا حصہ ہی وصول نہ کرتے تھے بلکہ اپنا حصہ بھی اس طور وصول کرتے تھے کہ بچارہ دہقان زیادہ سے

اپنی لنگوٹی اور بیوی بچا سکتا تھا۔ اس لئے کھیتوں کے کھیت بے کار پڑے تھے۔ لوگ جنگلی نباتات کی کھیتوں سے حاصل ہونے والے اناج پر ترجیح دیتے تھے۔ لارنس کا اپنا بیان ہے:

"مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا دور شروع ہوا تو کشمیری برہمنوں نے تمام طاقت اور حکم پر قبضہ کر لیا تھا۔ زمین جوتنے والوں سے جبراً کام کرایا جاتا تھا کہ یہ برہمن آرام سے رہیں۔ ۱۸۸۹ء میں ریاست کشمیر دیوالیہ ہو گئی تھی۔ زرخیز زمین بے کار پڑی تھی۔ فوج کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کسانوں کو ہل چلانے اور بیج بونے پر مجبور کریں۔ اس سے بدتر یہ تھا کہ یہ فوجدار فصل ہونے کے وقت بلائے درماں کی طرح آن دھمکتے تھے۔ ریاست کا حصہ وصول کرنے اور اپنا حصہ بٹورنے کے بعد یہ جنگی سورما اس نشے کا بس نام ہی چھوڑتے تھے جس سے کشمیری کاشتکار ظالم جاڑے میں اپنا پیٹ بھر سکتا ہو۔ وہ یہ کشمیری محاورہ دہراتے رہتے تھے: "بَتہٕ بَتہٕ تہٕ پِشاد پَتہٕ" (ہم کھانے کے لئے تڑپ رہے ہیں اور فوجدار ہماری پیٹھ پر چابک برسا رہا ہے) دوسری طرف راج دھانی میں سرکاری اہلکار اور ..... مزے لے رہے تھے۔ کچھ بھی ہو انہیں سستا چاول اور سستا ایندھن چاہیئے ..... جب میں سندر وادی میں پہنچا تو مجھے فوراً لگا کہ مجھے ٹھٹھرتے ہوئے جذبات سے قبول کیا جا رہا ہے۔ مہاراجہ بندوبست تو چاہتا تھا لیکن تقریباً ہر ایک سرکاری اہلکار تہیہ کئے ہوئے تھا کہ بندوبست نہیں ہونا چاہیئے جس سے اُن کے مفاد پر آنچ آ جائے۔"

چنانچہ گاؤں والوں کو ہدایت ہوئی کہ اس گورے افسر کو منہ مت لگاؤ اور کہ اسے جلد ہی کمبل میں لپیٹ کر واپس بھیج دیا جائے گا۔ صورت حال اتنی سنجیدہ ہوئی کہ وہ گاؤں گاؤں پھرتا تو تھا لیکن کسان اُس سے اس طرح منہ موڑ لیتے تھے جیسے وہ پلیگ کا بھوت ہو۔ وہ انہیں سمجھاتا تھا کہ دیکھو تم میرے

سوالات کا جواب نہ دو گے تو سارا بندوبست چوپٹ ہو جائے گا اور تکلیف تمہیں تم کو ہوگی لیکن خود اُس کے حسرت ناک الفاظ میں: "مگر اُن سے بات کرنے کے بدلے اگر میں گاؤں کی زیارت یا گل سوسن سے بھرے ہوئے مزار سے گفتگو کرتا تو ایک جیسی بات ہوتی"۔ لارنس کو تنخواہ نہیں مل رہی تھی۔ وہ ڈبل روپیوں کے بدلے سرسوں کے بیج یا سنگاڑے لینے کی ترغیب دے رہے تھے .... وہ بہت پریشان تھا۔ ایک دن وہ مہاراجہ سے فریاد کرنے کو چلا آیا۔ پرتاپ سنگھ معزول تھا اور اُس کا بھائی امر سنگھ اقتدار کا مالک۔ لارنس نسیم باغ میں پرتاپ سنگھ کے پاس دہائی دینے کے لئے پہنچ گیا۔ مہاراجے نے کہا کہ "تم میرے بھائی کے پاس جاؤ۔ وہی مہاراجہ ہے"۔ بچارہ صاحب خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

لیکن اُس کے صبر کا پیمانہ ذاتی محرومی پر نہیں بلکہ ایک عوامی المیے پر چھلک گیا۔ وہ ایک دن لار پرگنے میں گزر رہا تھا کہ سونہ مرگ پہنچ کر اپنی میم کی خبر لے۔ وہ گھوڑا بدل رہا تھا کہ ایک کارندہ اُس کے پاس آکر کہنے لگا کہ گاؤں میں ایک ایسی چیز ہو رہی ہے جس کا مشاہدہ اُس کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ وہ گاؤں میں گیا تو وہاں ایک عمدہ سے مکان کے آگے کسانوں کی بھیڑ جمع تھی۔ وہاں اُس نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اُس کے مُنہ سے خون بہہ رہا ہے اور اس کی ایک طرف کی مونچھ صفا چٹ ہے۔ بقول لارنس:

"یہ حال کس نے بنا دیا ہے" میں نے پوچھا۔

"کرنل نا تھا نے"، بھیڑ نے جیسے نعرہ بلند کیا۔

لہ پرتاپ سنگھ اور امر سنگھ کی یہ آنکھ مچولی ۱۹۰۹ء میں امر سنگھ کے گھوڑے سے گرنے اور مر جانے تک جاری رہی اور اُس [illegible] (باقی اگلے صفحے پر)

کرنل ناتھا ایک خوب رو ڈوگرہ افسر تھا۔ مہاراجہ کا رشتہ دار۔ وہ مکان سے باہر آیا اور مجھے اور بھیڑ کو حقارت سے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا کیا "تم کرنل ناتھا ہو؟"

"ہاں ہاں۔ مگر تم کس باغ کی مولی ہو؟" ناتھا غرّایا۔

"حکومت کشمیر کا ایک خادم۔ کیا تم نے اس آدمی کی آدھی مونچھ صاف کروا ڈالی؟"

"ہاں۔ وہ اس وقت تک گلگت جانے پر آمادہ نہیں ہوتے جب تک ہم ان کی مرمت نہیں کرتے۔ کشمیری ظلم پرست ہیں۔" ناتھا بولا۔

"اچھا تو کان کھول کر سُن لو۔ اگر تم سرکاری ملازم رہتے ہو تو میں اس ریاست کی ملازمت چھوڑ دونگا۔"

اور مستقل مزاج انگریز نے اپنا قول سچ کر کے دکھایا۔ اُسے اُس زمانے میں مہاراجہ کے رشتہ دار کو کشمیر بدر کروانے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ اُن کی تفصیل اُس نے بیان کی ہے۔ بہر حال اُسے جموں بھیج دیا گیا۔ وادی سندھ میں بیگار پر پابندی عائد ہوگئی۔ لیکن اس سے دیہاتیوں کے ہونٹوں پر لگے تالے بھی کھل گئے ___ خود اُس کی زبانی:

"ناتھا کشمیر میں میری ساری مشکلیں اپنے ساتھ لے گیا جب میں دیہات

اس کا شکار ہو گیا۔ بعد میں پرتاپ سنگھ اور امر سنگھ کے بیٹے ہری سنگھ کے درمیان یہ چپقلش جاری رہی جو ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے انتقال کے بعد ہری سنگھ کی جانشینی میں منتج ہوئی لیکن پرتاپ سنگھ کے خلاف ایک غیر تحریری سازش اُس کے خانوادے میں اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ دھرم ارتھ کی جو تعمیرات بن رہی ہیں اُن پر اُن کے نام کا سایہ پڑنے نہیں دیا جاتا۔

میں واپس گیا تو بڑوں کا کیا ہی کہنا بچے بھی مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ ایک وحشتناک خاموشی کی بجائے اپنایت بھری گپ شپ میرے لئے حیران کن بھی تھی اور کسی حد تک شرمندگی کا باعث بھی۔ چنار اور اخروٹ کے درختوں کے سائے میں چھلچھلاتی ہوئی نیلے پانی کی ندیوں کے کنارے ہری بھری گھاس پر وہ گھنٹوں بولتے رہتے اور میں سُنتا رہتا۔ اور اس سے بھی اچھا یہ کہ جب راتیں ٹھنڈی پڑنے لگیں وہ دیودار کی لکڑی سے جلائے گئے الاؤ کے گرد اگرد بیٹھتے نتھنوں میں بُرزے میں لپیٹی ہوئی نسوار ڈالتے اور مجھے دلچسپ قصے سُناتے۔"

اور پھر بندوبست مکمل ہو گیا۔ کشمیری کسان کی نجات کا پہلا پتھر نصب ہوا۔ "بنا کشمیر کی تعمیر کا پتھر"۔ مہاراجہ نے اس کی سفارش پر بندوبست رپورٹ مکمل ہونے کے تین برس بعد یعنی ۱۸۹۶ء میں اسے لاگو کر کے تیس لاکھ روپے کا بقایا مالیہ معاف کر دیا۔ کھیت کی پیداوار کا ایک خاص حصہ نقدی کے بدلے جنس کی صورت میں مالیہ قرار پایا... سرکاری گدھوں کے ناخن نوچ تو نہ لئے گئے لیکن اُن پر قواعد کی ٹین کی چادر چڑھا دی گئی۔ لارنس نے کشمیر کا سب سے پہلا سیٹلمنٹ انجام میں لا کے کشمیر کی اُس سرزمین پر کشمیریوں کی بحالی کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا جسے انگریزوں کی حکومت نے گلاب سنگھ جموں والے کے ہاتھ بازاری مال کی طرح بیچ دیا تھا۔ یہی کشمیر میں بیگار کی لعنت کے خاتمے کا آغاز بھی تھا۔

بندوبست کے بعد کشمیر کے کھیتوں سے ظلم کا ٹڈی دل چھٹنے لگا۔ اب فوجدار نہ آتے تھے۔ تحصیل کا چپراسی آتا تھا۔ لارنس ایک دیہاتی کا ماجرا بیان کرتا ہے وہ ایک دن اپنی گود میں ایک بچے کی لاش لیجا رہا تھا۔ اُس کے گاؤں کے نمبردار نے اُسے گاؤں میں اُس کی قبر کے لئے چند فٹ زمین دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک اور دن اُس کے پاس ایک فریادی آیا جس نے اس کی درخواست لینے سے

انکار کر دیا تھا کہ یہ اُس کے دائرہ اختیار میں نہ آتی تھی۔ وہ آج پھر آیا اس کے ہاتھ میں
کاغذ تھا۔ لارنس چڑ گیا اور کہا کہ اسے اندر مت آنے دو۔ فریادی ہاتھ میں کاغذ کو
زور زور سے لہرانے اور چلانے لگا "یہ درخواست نہیں ہے۔ گیت ہے۔" جب
اُس نے گیت سُنایا تو اُسمیں لکھا تھا صاحب کے بندوبست کی وجہ سے آج کشمیر
میں گیدڑ، بھیڑ اور ساگ کا کرم ایک ساتھ رہتے ہیں۔"

لارنس نے اپنے کانوں سے ہی اپنی تعریف نہیں سُنی بلکہ اُس کے بعد لڑکی شاؤ
اُس کے شاندار کارنامے "سوچھ" کے گیت گاتے رہے۔ ؎

بندوبست لارنن کوٗر نہ لو لو
گرٛ لیتھن سوچھ تمٛ سوٗر تہٕ لو لو

اُس کی یاد کشمیری کی اجتماعی یاد کا ایک حسین وجمیل جُز بن گئی۔ لوگ کوی پہ ہی کیا
مدار مہجور کا شمیری نے اپنے ابتدائی دنوں میں لکھا:

. . . . ازدم سر لارنس چو رشک صد گلزار شُد
دفع شُد جور سزاول رفع ظلمِ کاردار ازتفنگِ معدلت شق سینۂ شقدار شُد

اور کشمیریوں کے ایک بڑے ہی غمگسار پیرزادہ محمد حسین عارف نے جو بہل
اس صدی کی پہلی دہائی میں ہائی کورٹ کے جج بھی رہے، لکھا ؎

دُعائیں جان کو لارنس کی دو، ہے طفیل اُسکا
زمینداروں کی حالت کو جو کچھ سنبھلا ہوا دیکھا

؎ کشمیری شال، گب نہ ہا کہ ژر جو کشمیر کے ایک عُقدے کا موضوع ہیں کہ کس طرح دو دو کر کے یہ پُل پار کر سکتے ہیں۔

پریم ناتھ بزاز نے راقم الحروف کے نام ایک خط میں لکھا۔ (یہ خط کلچرل اکادمی کی طرف سے لارنس کے سرینگر میں مجسمے کو بحال کرنے کی کوشش کی خبر سُن کر لکھا گیا تھا)۔

"دوسری بات میں سر والٹر لارنس کے مجسمے کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ سُن کر بہت دُکھ ہوا کہ یہ مجسمہ اپنے شایانِ شان مقام پر نہیں ہے۔ لارنس نے چند سال کشمیر میں رہ کر جو کام کشمیریوں کو ذلت سے نکالنے کے لئے کیا ہے وہ آج تک نہ کوئی حکمران یا حاکم اور نہ ہی کوئی لیڈر کر سکا ہے جس کا جیتا جاگتا ثبوت اُس کی معرکت الآرا کتاب "ویلی آف کشمیر" ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کشمیر سرکار کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سر والٹر لارنس، لارڈ کرزن وایسرائے ہند کے پرائیویٹ سیکرٹری بن گئے تھے اور اُس حالت میں بھی اُن کو کشمیر کی یاد ستاتی تھی اور وہ اس کے بے بس لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اُن کا چھوٹا سا مجسمہ کشمیریوں کی ناقدر شناسی کا رونا رو رہا ہے۔

اگر سر والٹر کا آدم قد نیا بُت کہیں چورلہے (لال چوک) میں نصب کر دیا جائے تو واجبی ہوگا اور لارنس کے نام کی صحیح قدر ہوگی۔ میری رائے میں کشمیری عوام کو اس کے لئے مانگ کرنی چاہئیے۔ کاش کشمیری لیڈر اپنے حقیقی مربیوں کو پہچان سکتے اور اُن کی قدر کرنا جانتے۔ جب تک قد آدم بُت نہیں بنتا تب تک میری رائے میں اس چھوٹے سے مجسمے کو ہی کسی نمایاں جگہ پر از سرِ نو نصب کرنا عین تدبّر ہوگا۔"

پریم ناتھ بزاز

(بحوالۂ مجلہ اکادمی

اکتوبر سنہ ۱۹۷۳ء)

خود لارنس جب اپنے وطن انگلستان گیا تو وہاں بوڑھاپے کے دن کشمیر کی یاد میں گزارنے لگا۔ وہ کشمیری زبان سیکھ کر گیا تھا جس کی گواہ اس کی معرکتہ الآراء کتاب "دی ویلی آف کشمیر" ہے۔ انگلستان میں وہ اپنے عزیز دوست اُڈیارڈ کپلنگ سے کشمیر کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اس کی ایک کتاب کا پیش لفظ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ وہ چارلس ڈکنز کی بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر اُسے کشمیر کے قصے مزے لے لے کر سناتا تھا۔ کشمیر میں اُس نے "تاریخ حسن" کے مصنف حسن کھویہامی سے دوستی کی اور اُس کی حوصلہ افزائی کے بعد اُسے اپنا اُستاد کہہ کر پکارا۔

لارنس نے جو عظیم کام کیا وہ یہ ہے کہ اُس نے بیع نامہ امرتسر پر پہلی ضرب لگائی۔ کشمیر کی جو دھرتی گلاب سنگھ نے رسوائے عالم بکری پتر سے کشمیریوں سے چھین لی تھی اُس کی حقداروں کو بحالی لارنس نے شروع کی۔

کشمیر کو لارنس کا ہمیشہ بہار تحفہ اُس کی کتاب "دی ویلی آف کشمیر" ہے۔ یہ کشمیر کی تواریخ، جغرافیہ، جیالوجی، زبان، زراعت، باغبانی، چرند و پرند، سماجی زندگی غرض کشمیریوں کی ساری کائنات پر محیط ہے اور میں اسے کشمیر کا پہلا اور بنیادی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔ اس کا مواد جمع کرنے کے لئے اُس نے کتنی عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ باریک ٹائپ میں کوئی پونے پانچ سو صفحات کی اس کتاب کو پڑھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ کشمیر پر بہت کام ہو رہا ہے لیکن ابھی لارنس کی کتاب کا نعم البدل نہیں مل سکا ہے۔ اس کے کتنے ہی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور کشمیر شناسی میں اس نے جو رول ادا کیا ہے اس کی اہمیت کو گھٹایا نہیں جا سکتا۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں کشمیریوں کو پرکھنے کے متعلق ایک نیا نظریہ اُبھرتا ہے۔ ہمدردانہ ہی نہیں دردمندانہ بھی۔ اُن کی "جعلسازی" کے جو قصے بیان کئے جاتے تھے اُن کی قلعی کھولی گئی ہے

اور ناسور کے اصل سرچشموں کو عریاں کر دیا گیا ہے۔ ان تحریرات میں کشمیر کے بارے میں ایک ایسی آواز اُبھرتی ہے جو آج بھی کشمیر کے خیر خواہوں کے دل میں گونج پیدا کرتی ہے۔ چند مثالیں :-

- "کشمیریوں کے لبوں پر" عزت" کا لفظ بار بار مچلتا ہے۔ اُنہیں اِس بات سے سخت کوفت ہوتی ہے کہ اُن کے حکمران اُن کی عزت نہیں کرتے۔"
- "کشمیر ایسا ہے، جیسا اُس کے حکمرانوں نے اُسے بنایا ہے۔"
- "یہ بات اُن کی تعریف بن جاتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے بدتر نہیں ہیں۔ خاص طور جب یہ ذہن میں رکھا جائے کہ اُنہیں سچا، اچھا، بہادر اور خود دار بننے کے کتنے کم مواقع دیئے گئے ہیں۔"
- "کشمیریوں کی ایک الگ قومیت ہے، الگ کردار ہے، الگ زبان، الگ پہناوا ہے اور الگ رسوم و رواج ہیں .... یہ سب بڑے دلچسپ ہیں۔"
- "سارے مشرق میں میں نے کشمیری پنڈتوں سے زیادہ ذہین اور مہذب طبقہ کہیں اور نہیں دیکھا۔"
- "کشمیری مسلمان عجیب ہیں۔ وہ دل سے اب بھی ہندو ہیں۔"
- مجھے امرناتھ آنے والے یاتریوں سے خطرہ رہتا تھا کیونکہ وہ کالرا کے جراثیم اپنے ساتھ لاتے تھے اور پھر کشمیر اُجڑ جاتا تھا۔ مہاراجہ سے بات ہوئی تو وہ اُن کے کرما پر زور دینے لگا۔ حالانکہ میں کرما سے زیادہ کالرا کی سوچ رہا تھا۔"
- "کشمیری ڈرپوک تو ہے۔ مگر ذہین بھی ہے اور دانشور بھی۔"
- "کشمیر کو دُنیا کے زرخیز اور خوشحال ترین ملکوں میں سے ایک بنانے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ پہلی بات ایک صاف ستھرا اور لائق انتظامیہ ہے

اور دوسری یہ کہ آبادی میں بتدریج اضافہ ہو۔"

○ "میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کشمیری مشرق کی کسی اور عظیم قوم کی طرح ہی عظیم ہیں۔"

اب آخر پر لارنس کی قوتِ مشاہدہ کے چند نمونے جن سے اُن کی شخصیت کے گوشے بھی آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ درد مند۔ باوقار SENSE OF HUMOUR سے بھرپور اور بہت ہی باخبر۔

○ "کشمیری عورتیں بارہ سے چودہ بچے جنتی ہیں۔ مگر کشمیر میں پھر بھی بہت کم آبادی ہے۔"

○ "کشمیر میں ۱۸۹۲ء کی وبا میں اٹھارہ ہزار لوگ مرے۔ لوگ دن بھر قبرستان میں ہی رہتے کہ وہاں تابوتوں کا ایک لامتناہی جلوس چلا آتا تھا۔ کفن فروش کی دکان ہر وقت کھلی رہتی تھی۔"

○ "ایک دن میں امیرا کدل سے گزر رہا تھا۔ ایک بوڑھے نے ایک مہاسیر مچھلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'مہاراجہ رنبیر سنگھ اس مچھلی کی صورت میں پھر پیدا ہوا ہے اور اسی لئے اس کے شکار پر پابندی ہے۔"

○ "ایک دن میں نے اپنے خیمے کے باہر ایک بوڑھے پنڈت کو دیکھا۔ سر کے بل پر کھڑا تھا اور ٹانگیں اوپر کو۔ میں نے پوچھا ماجرا کیا ہے۔ اُس نے اسی صورت میں جواب دیا "تمہارے بندوبست کا بھلا ہو۔ میرے معاملے اس طرح الٹ پلٹ گئے ہیں کہ اب مجھے پتہ نہیں کہ میں پیروں پر کھڑا ہوں یا سر پر۔" جی ہاں۔ یہ لوگ کہتے تھے بندوبست سے شہر میں قیمتیں بڑھ گئی ہیں اور بے گار کے خاتمے سے مفت مزدوری کرنے والے نہیں ملتے۔"

○ "جب میں نے کام شروع کیا تو ہر چیز پر ٹیکس تھا۔ میوہ دار درخت، برزہ

بنفشہ، کھالیں، ریشم، زعفران، تمباکو، سنگھاڑے، کاغذ۔ شادی ٹیکس اور مُردہ دفنانے پر ٹیکس۔ طوائفوں پر ٹیکس۔ غرض کشمیر میں ہوا اور پانی کے سوا ہر چیز پر ٹیکس لیا جاتا تھا۔"

○ "میرے قیام کے دوران کشمیر میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہ ہوا۔ حالانکہ ایسے بلوے میدانوں میں ہوتے رہتے ہیں۔"

○ "مہاراجہ نے دُو مرتبہ کشمیر تک ریلوے لائین بچھانے کی تجویز مسترد کر دی۔"

○ کشمیری جسمانی طور بڑے خوبصورت ہیں۔ اُس نسوانی لباس کے باوجود جو بیرونی ظالموں نے اُن پر مسلط کر دیا ہے، کشمیری عورتیں اپنی کشش اور حُسن کے لئے مشہور ہیں۔ کاشتکاروں، کاریگروں اور فن کاروں کی حیثیت سے اُن کا کوئی ہمسر نہیں۔"

○ "ذہانت میں کشمیری پنڈت کو مات دینا بہت مُشکل ہے اور سارا ہندوستان یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔"

○ "کشمیر میں بھگتوں کے کھیل مقبول ہیں۔ میں نے ان نقالوں سے حاکموں کے بُرے لچھنوں اور کسانوں کی چالاکی کے کتنے ہی گُر سیکھے۔"

○ "سنہ ۱۸۹۳ء میں کشمیر میں سیلاب سے چھ ہزار مکان بہہ گئے۔ سرینگر کے سات میں سے چھ پل تباہ ہو گئے۔ میرے مکان کے پہلے طبقے میں پانی گھس آیا لیکن میری خوش قسمتی اور پنڈتوں کی بد قسمتی سے میرے بندوبست کے کاغذات محفوظ رہے۔"

○ "کشمیر میں اولیا کو خوش کرنے کے لئے علم (جھنڈے) اُٹھانا بڑا پسندیدہ شغل ہے۔ کسی آفت کے نمودار ہونے پر انہیں زیارتوں سے نکالا جاتا ہے۔"

○ "کشمیر میں جُرم کا نشان نہیں ہے۔ کسانوں میں بددیانتی کے جرائم تو سُننے میں ہی نہیں آتے۔ جائیداد بالکل محفوظ ہے۔ میں نے گاؤں میں جو چھ سال گزارے

اُن کے دوران میں نے کسی کسان کے ہاتھوں چوری یا سرقے کی شکایت نہیں سُنی۔ اس سے یقیناً یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کشمیری ہرگز بد دیانت قوم نہیں جس کا اتنا زبردست ڈھنڈورہ پیٹا جاتا ہے۔"

○ "کشمیریوں کے متعلق جو سخت و سُست سُننے میں آتا ہے اُس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ اُن کے کردار کے سرکاری ترجمان باہر والے ہیں۔ وہ (بیرونی ترجمان) اکثر بے ایمان اور ہر حالت میں غیر ہمدردانہ ہوتے ہیں۔"

○ "کشمیریوں کے قومی کردار پر مغلوں، پٹھانوں، سکھوں، ڈوگرہ وغیرہ حکمرانوں نے کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ کشمیری اب بھی وہی ہیں جو اُس وقت تھے جب مغلوں نے کشمیر کو فتح کر کے اسے باقی ہندوستان کے ساتھ ملا دیا۔"

لارنس نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے جس کو ہم عصر کشمیر کے حالات میں ستم ظریفی سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے زمانے سے ذرا پہلے کشمیر میں ایک سخت گیر صوبیدار وزیر پنّوں حکومت چلاتا تھا۔ اُس نے کچھ اچھے کام کئے لیکن کشمیری اُس کی رعونت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بار بار کہتے تھے "وزیر گلہٕ دود ژلہٕ" (وزیر فنا ہو تو سارے دُکھ ختم ہو جائیں گے)۔

لارنس کے علاوہ آرل سٹائین، جارج گریرسن وغیرہ نے بھی کشمیر پر علمی کام کیا لیکن لارنس صرف کتابی آدمی نہ تھا۔ اُس نے عمل کی دُنیا میں کشمیریوں کی نجات کے سامان بہم کئے اسی لئے اس کا نام جہاں ایک طرف سٹائین اور گریرسن کے ساتھ شامل کرنا پڑتا ہے وہاں دوسری طرف ٹینڈل بسکو کے ساتھ بھی۔ سچّی بات یہ ہے کہ تاریخ کا حصّہ بننے کے بعد وہ انگریز نہیں رہا بلکہ بہت سے بے ضمیر کشمیریوں سے زیادہ کشمیری اور قومی وراثت کا ایک حصّہ ▲▲▲
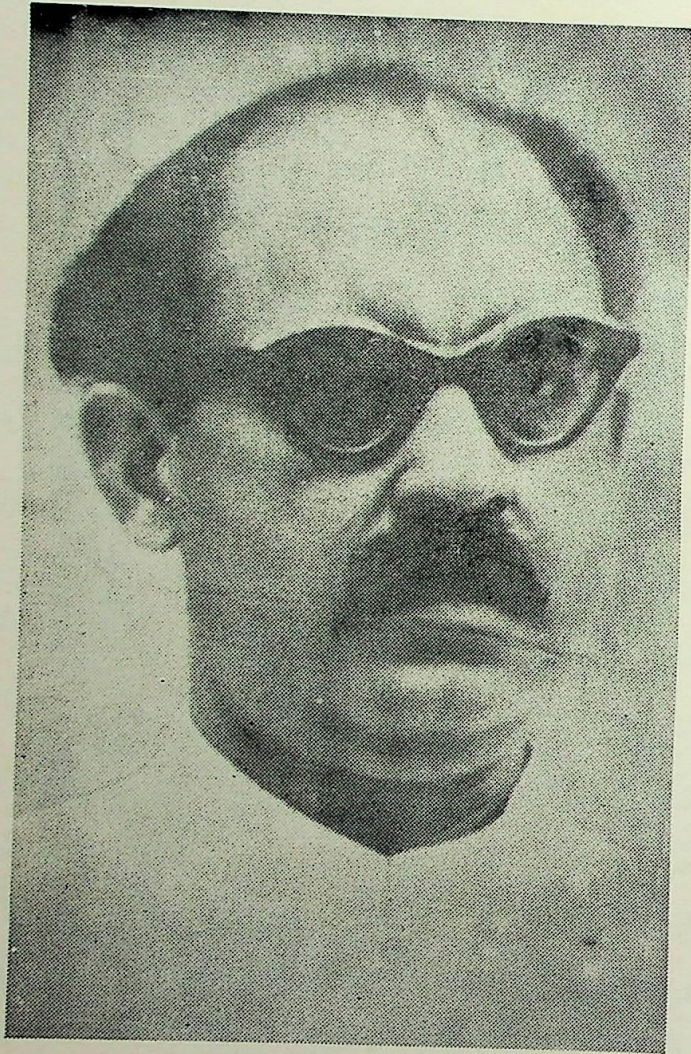
چراغ حسن حسرت (بشکریہ نذر بونیاری)

میرواعظ مولانا رسول شاہ

مولوی محمد ابراہیم

میرواعظ مولانا رسول شاہ

کسی قوم اور ملک میں ایسی شخصیت کا وجود جس کی نظر مستقبل کے تقاضوں اور بدلتے ہوئے حالات پر ہو، خدا تعالیٰ کی ایک عظیم اور بے بہا نعمت سے کم نہیں ہے۔ ہندوستان میں اس کی مثال سرسید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی کی ذاتِ والا صفات اور کشمیر میں میرواعظ مولانا رسول شاہ صاحب کی صورت میں ملتی ہے۔ یہ بزرگ تاریخ ہند کے جس دور میں ہوئے ہیں وہ ایک تہذیب کے انحطاط اور دوسری تہذیب کے جنم لینے کا دور تھا۔ اس دور میں مغل تہذیب کی پرانی قدریں مضمحل اور انگریزی تہذیب کی رو بہ ارتقا ہو رہی تھیں۔ آئندہ کی زندگی میں وہی قوم زندہ اور پنپ سکتی تھی جو زمانے کا ساتھ دیتے ہوئے اس کی ڈگر پر راہ پیما ہو۔ سرسید، حالی اور مولانا رسول شاہ صاحب نے اس حقیقت کو سمجھا اور اس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہوئے۔ ریاست جموں و کشمیر میں انجمن نصرۃ الاسلام، سرینگر کا قیام، جو مولانا رسول شاہ کی انتھک مساعی کا نتیجہ ہے، اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

برِصغیر ہند و پاک کے علماء میں علمائے کشمیر کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ بھارت کے دیگر علماء کے برعکس خود تو علوم دینیہ سے آراستہ و پیراستہ

ہوتے ہیں، مگر اپنی اولاد یعنی بیٹوں اور بیٹیوں کو جدید علوم کا حامل دیکھنا چاہتے
ہیں جبکہ ہندوستانی علماء خود تو عربی کے علوم معقولہ و منقولہ کے ماہر ہوتے ہیں۔
لیکن اپنی اولاد کو یا تو مطلق تعلیم نہیں دیتے اور اگر دیتے بھی ہیں تو پھر "ملّا کی دوڑ
مسجد تک" کے مشہور مقولے کے تحت صرف قرآن و حدیث اور دیگر علوم دینیہ سے
باخبر کر کے امورِ دنیا کا انہیں مطلق نہیں چھوڑتے۔ تعلیم کے معاملے میں یہ دقیانوسیت
اور پرانی لکیر کا فقیر رہنا یقیناً علمائے کشمیر کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ علمی و تعلیمی
معاملات میں زمانے کے مقتضیات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں یقیناً منفرد
اور ممتاز ہیں اور اسی کی مثال ہمارے زیر بحث بزرگ مرحوم میر واعظ مولانا رسول
شاہ صاحب کی ہے۔ آپ کشمیر میں مسلمانانِ کشمیر کے لئے نئی اور مروجہ تعلیم کے نقیب
اور پیشرو ہیں۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو آپ کو مسلمانانِ کشمیر کے ہر طبقہ اور مکتب ہر
خیال کے لوگوں میں محبوب اور ہر دلعزیز بنائے ہوئے ہے۔ جب کبھی آپ
کا نام لیا جاتا ہے تو صرف مذہب کے ایک عالم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس اعتبار
سے کہ آپ قوم کے مُصلح اور دینی و دُنیوی امور میں حقیقی معنوں میں ایک رہبر
و رہنما تھے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے اختتام اور
بیسویں صدی کے آغاز پر کشمیر میں اگر آپ کا وجودِ مسعود نہ ہوتا تو یقیناً کشمیر کی مسلمان
قوم علوم عربیہ و فارسیہ کی بھول بھلیوں میں ٹکر مارتی پھرتی اور سرکاری ملازمتوں میں
وہ جگہ نہ پاتی جو آج اُسے حاصل ہے۔ سچ ہے

نگاہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز ... یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

یہ امر متذکرہ صدر سطور میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ میر واعظ مولانا
رسول شاہ کشمیر میں علاوہ علوم عربیہ دینیہ کے مبلّغ اور پرچارک کے اہل کشمیر اور بالخصوص
یہاں کے مسلمانوں کے لئے جدید اور مروّجہ انگریزی علوم کے بھی نقیب اور پیشرو تھے۔

ہمارے خیال میں اس کی تین وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا رسول شاہ صاحب اپنی نظر دوررس سے پہچان گئے تھے کہ ہندوستان کی آئندہ تعلیمی و سماجی زندگی کس نوعیت کی ہوگی اور یہ کہ اس میں اسی شخص کا حقیقی حصہ ہوگا جو علوم انگریزیہ سے آراستہ و پیراستہ ہو۔ اس لئے قدیم تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کی بھی انہوں نے بھرپور وکالت کی جو یقیناً وقت کی پکار تھی۔ دوسرے یہ کہ عین اسی موقعہ پر لاہور میں انجمن حمایت اسلام اور علی گڑھ میں سر سید احمد خان مرحوم کے ذریعہ مدرستہ العلوم علی گڑھ قائم ہو چکا تھا۔ شمالی ہند کے یہ دونوں ادارے مسلمانان ہند کو علوم قدیمہ کی بجائے علوم جدیدہ کی طرف جن کا مطلب انگریزی علوم سے تھا، دعوت دے رہے تھے۔ کشمیر میں مولانا رسول شاہ بھی وقت کی اس پکار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اسلئے سرینگر میں اپنے محدود وسائل کے ذریعہ ادارہ انجمن نصرۃ الاسلام کی بنیاد ڈال دی جس کا مقصود مسلمانوں کو زیادہ تر سرکاری ملازمتوں میں حصہ دلانا تھا اور جس میں بصیر النقول طور پر کامیاب ہو گئے۔ تعلیم جدید کے سلسلے میں بالعموم مولانا رسول شاہ کو "سر سید کشمیر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانائے مرحوم سر سید کے مدرستہ العلوم علیگڑھ کے بالمقابل زیادہ تر انجمن حمایت الاسلام پنجاب لاہور کی جدید علوم کی مساعی سے متاثر تھے جس کا سبب کشمیر سے پنجاب کا قرب اور اس زمانے میں پنجاب سے کشمیر اور کشمیر سے پنجاب کو لوگوں کی آمد و رفت تھا۔ لیکن شہرت سر سید کو ملی اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی تاثیر گمنامی میں رہی۔ خود کشمیر میں تعلیم کی اس جدید تحریک کا نام نصرۃ الاسلام اس نظریئے کی تائید کرتا ہے کہ مولانا رسول شاہ کشمیر میں انجمن نصرۃ الاسلام کے قیام کے سلسلے میں بجائے سر سید مرحوم کے انجمن حمایت اسلام لاہور کے عمائدین سے زیادہ متاثر تھے۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ دونوں انجمنوں کے قیام کا مطمح نظر جدید اور قدیم تعلیمات کا ازدواج اور دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر یکجا یکجہت

دور کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ دونوں انجمنوں کا تعلق حمایت اور نصرۃ اسلام سے ہے۔

جدید تعلیم کے سلسلے میں کشمیر میں انجمن نصرۃ الاسلام کے قیام کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ کشمیر دنیا کی حسین وادی اور یہاں کے لوگوں کے حسین اشخاص ہونے کے پیش نظر ہندوستان کے حاکم انگریزوں کو یہ خطۂ سرزمین انتہائی محبوب اور پسندیدہ تھا۔ چنانچہ اہل کشمیر میں عیسائیت کے پرچار کے پیش نظر انہوں نے وادی میں اسپتال اور انگریزی مدارس کا جال بچھانا شروع کر دیا تھا اور چونکہ بسبب حاکم ان کی ہر بات اور ادا میں جاذبیت تھی اس لئے اہل دل گھبرا گئے کہ اگر حالات کی یہی نوعیت رہی تو خطرہ ہے کہ مسلمانان کشمیر دین قدیم کو چھوڑ کر عیسائیت کے دامن میں پناہ نہ لیں۔ چنانچہ اس حقیقت کے پیش نظر کشمیر کے کچھ خاندان جو ہر چمکدار چیز کو سونا سمجھنے کے عادی تھے اسلام سے برگشتہ ہو کر عیسائیت کے پہلو میں چلے گئے تھے۔ یہ کیفیت دیکھ کر غالباً مولانا رسول شاہ میں اس امر کا شدید احساس ہوا اور بطور اس کی کاٹ کے انہوں نے انگریزی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے مدرسۂ نصرۃ الاسلام سری نگر، کشمیر کی بنیاد ڈالی۔ اور اس طرح عیسائیت کا جو سیلاب آئندہ اٹھنے والا تھا مولانا نے ابتدا ہی میں اس کا تدارک (سدباب) کر دیا۔ بقول سعدی شیرازی ؎

سرِ چشمہ شاید گرفتن بمیل — چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

(چشمہ کا سرا سلائی سے بند کیا جا سکتا ہے مگر جب بھر گیا تو ہاتھی کے ذریعہ بھی اس سے نہیں گزرا جا سکتا ہے)

انجمن نصرۃ الاسلام، جو آغاز میں مدرسۂ نصرۃ الاسلام کہلاتی تھی، اس کے قیام و تاسیس (بنیاد) کی جو وجوہات بھی ہوں یہ حقیقت ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر

کشمیر میں اس کا قیام تن تنہا میر واعظ مولانا رسول شاہ مرحوم کا ایک عظیم اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت کس قسم کی متنوع اور زمانہ شناس تھی۔ صاحب تحایف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار صفحہ ۳۱۲ پر مولانا رسول شاہ صاحب کو اس مدرسہ کے قیام پر ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ خراج آپ کے والد حاجی محمد یحییٰ واعظ متوفی ۲۴ رماہ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ (مطابق اتوار، ۳ رمئی ۱۸۹۱ء) کی وفات اور اولاد کے سلسلے میں ہے۔

بہرکیف ابو محمد مسکین حاجی محی الدین بن ملا محمد احمدی متذکرہ صدر تحایف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار میں مولانا رسول شاہ کی نسبت لکھتے ہیں:-

"و چہار فرزند ارجمند در عقب ایشان باقی ماندند۔ اولہم واعظ رسول صاحب وفی زماننا ہذا بوعظ و نصایح اہل ایندیار زینت بخشیدہ است و در ہر امر ترقی یابندہ، بیت

شد از فضل حق مقتدائے زمان
امانش دہاد از شر حاسدان

و بہ اہتمام جمیل و کوشش جزیل مدرسہ نصرۃ الاسلام برائے طالبان احکام دین اسلام بنا نمود، طفلان خاص و عام بہ تعلیم آن بہرہ یاب و فایدہ مند گردیدند۔"

(اور چار قیمتی فرزند آپ کے یعنی واعظ مولوی محمد یحییٰ کے پیچھے یادگار ہیں۔ ان میں سب سے پہلے واعظ رسول صاحب ہیں جو ہمارے اس وقت میں اس ملک کے باشندوں کے لئے وعظ و نصایح کے ذریعہ زینت بخشے ہوئے ہیں اور ہر معاملہ میں روبہ ترقی ہیں۔ آپ بفضل خدا پیشوائے زمانہ ہیں۔ اللہ آپ کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ آپ نے عمدہ اہتمام اور بھاری کوشش سے احکام دین اسلام

کے شائقین کے لئے مدرسہ نصرۃ الاسلام تعمیر کیا ہے تاکہ خاص و عام کے بچے یہاں
کی تعلیم سے بہرہ یاب و مستفید ہوں)۔

تاریخی اعتبار سے میرواعظ مولانا رسول شاہ نے مدرسہ نصرۃ الاسلام سرینگر
۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء کو جاری کیا۔ حروف جمل کے اعتبار سے اس کی تاریخ
تاسیس جو برلب سڑک مدرسہ کی شمالی دیوار پر سیاہ پتھر پر بحروف النسخ کندہ ہے،
"مدرسۂ فقہ و حدیث رسول" ہے جو بحساب حروف ابجد ۱۳۱۸ کے اعداد دیتی ہے
اور یہی اس کی تاریخ تعمیر ہے۔

میرواعظ مولانا رسول شاہ دینی واعظ اور مبلغ تو تھے ہی لیکن اس کے ساتھ
ہی مسلمانان کشمیر کی دنیوی ترقی کی تکمیل کے بھی خواہاں تھے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے
انہوں نے مدرسہ نصرۃ الاسلام قائم کیا تھا۔ اگرچہ مدرسہ نصرۃ الاسلام سرینگر کی بنیاد
۱۳۱۸ھ سے چند برس پہلے محلہ کاؤی کدل سرینگر میں ایک پرائمری اسکول کے ذریعہ،
جس میں صرف چار جماعتیں تھیں، پڑ چکی تھی اور جو بعد میں شیخ محلہ سری نگر میں منتقل
ہو گیا تھا۔ لیکن موجودہ جگہ پر حقیقی اور تاریخی بنیاد متذکرہ صدر تاریخ ہی میں پڑی۔
مولانا نے اس مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں جی توڑ محنت کر کے نہ صرف اس کی بنیاد ڈالی
بلکہ عملی طور پر پشت پر اس کی خاطر اینٹیں بھی ڈھوئیں۔ خوش قسمتی اور نیک فالی کے
طور پر یہ مقام، جو مولانا نے مدرسہ کی بنیاد کے لئے منتخب کیا، کشمیر کی قدیم تاریخ کی رو
سے ایک علمی جگہ تھی جہاں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ روایت کے مطابق
کھودنے پر یہاں سے بھوج پتر پر تحریر کتابیں برآمد ہوئی تھیں جو اس امر کی علامت
تھیں کہ کسی وقت یہ مقام بودھ مت کا علمی مرکز رہ چکا ہے۔ علاوہ کتب کے جو اشیاء
کھدائی پر برآمد ہوئیں ان میں شکستہ دواتیں اور تعمیرات بھی تھیں۔ تاسیس انجمن
کے سلسلے میں جو لوگ اس وقت مولانا کے معاون و مددگار تھے اور جنہوں نے

دامے، درمے، قدمے اور سخنے اس قومی کار خیر میں معاونت کی ان میں خواجہ حسن شاہ نقشبندی، خواجہ عزیز الدین کاؤسہ، مولانا محمد شریف الدین مفتی اعظم کشمیر، خواجہ عبدالصمد ککرو، مفتی ضیاء الدین، مولانا سلام الدین فاروقی (امام درگاہ حضرت بل) خواجہ سنجی درابو، میرزا غلام مصطفےٰ اور رئیس التجار خواجہ ثناء اللہ شال کے اسمائے گرامی لئے جا سکتے ہیں۔

بقول مصنف سیر الواعظین میرواعظ مولانا عتیق اللہ مرحوم برادر اصغر مولانا رسول شاہ "میرواعظ مولانا رسول شاہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ (مطابق پیر ۳ ستمبر ۱۸۵۵ء کو محلہ نایدہ دوری، راجوری کدل سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے" — مولانا عتیق اللہ مرحوم نے ۲۰ ذی الحجہ جمعہ کا دن قلمبند کیا ہے جبکہ "تقویم ہجری عیسوی" صفحہ ۶۴ کی رو سے ۲۰ ذی الحجہ پیر ۳ ستمبر ۱۸۵۵ء کا دن ہوتا ہے۔ جمعہ بارہ بجے ولادت کی صورت میں یہ تاریخ یا تو ۱۸ ذی الحجہ تھی اور یا پھر ۲۴ ذی الحجہ۔

بہر کیف مولانا رسول شاہ مرحوم ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ میں متولد ہوئے۔ اس وقت کے ایک بزرگ میر ثناء اللہ کریری نے "بَلَغَ العُلٰی بِکَمَالِہٖ" (وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا) سے تاریخ ولادت نکالی۔ خود مولانا رسول شاہ صاحب کے والد محترم میرواعظ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے آپکی ولادت میں فقرہ "نیرِ اعظم" (عظیم ستارہ یعنی سورج) کہا جو آئندہ چل کر آپ کے نام کا جزو بن گیا اور ساتھ ہی مادۂ تاریخ بھی قرار پایا۔

صاحب سیر الواعظین کے بقول مولانا رسول شاہ صاحب ابھی چار سال کے تھے کہ والد مرحوم مولانا محمد یحییٰ نے انہیں اپنے والد مولانا غلام رسول المعروف بہ لسہ بابا متوفی ۲۱ محرم الحرام ۱۲۶۱ھ (جمعرات، ۳۰ جنوری ۱۸۴۵ء) کے ایک شاگرد اخوند عبداللہ صاحب کے سپرد کر دیا۔ یہ بزرگ محلہ راجوری کدل، سرینگر

میں مکتب داری کیا کرتے تھے۔ انہی اخوند عبداللہ کے پاس مولانا رسول شاہ حفظ کلام اللہ کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ یادداشت اتنی پختہ اور جامع تھی کہ رمضان شریف میں تراویح کے موقعوں پر قاری کو اگر سہو ہو جاتا تو یہ پیچھے سے لقمہ دیا کرتے تھے۔ سچ ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بروایت مصنف "نیر اعظم" صفحہ ۸ "کلام الٰہی ازبر ہونے کے بعد والد ماجد کے وسیع حلقۂ درس میں شامل ہو کر علوم معقول و منقول سے فیض یاب ہوئے۔ ذہانت طبعی کا یہ حال تھا کہ ایک دن کا لیا ہوا سبق اپنے ہم جماعت طلباء کو بطور درس پڑھایا کرتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں علم قرآن (تفسیر)، علم حدیث، فقہ و صرف و نحو سے فارغ ہو چکے تھے۔ فراغت کے بعد اپنا بیشتر وقت مطالعۂ کتب میں صرف کیا کرتے تھے"۔

میر واعظ مولانا رسول شاہ کی چون سالہ زندگی کا بیشتر وقت اہل کشمیر کی رشد و ہدایت میں بسر ہوا۔ مولانا اگرچہ ۵ مارچ ۱۸۹۱ء میں والد مرحوم کی وفات کے بعد باقاعدہ میر واعظ کشمیر مقرر ہوئے۔ لیکن وہ تبلیغ کا فریضہ بحیثیت نائب میر واعظ ان کی زندگی میں بھی بجالاتے تھے۔ روایت کے مطابق آپ کے والد مولوی محمد یحییٰ صاحب کو ایک روز بازار مسجد، بہوری کدل، سرینگر میں مجلس وعظ منعقد کرنا تھی کہ اچانک طبیعت ناساز ہو گئی۔ مجبوراً اپنے ہونہار فرزند مولوی رسول شاہ کو عوام کی تشفی کے لئے روانہ کر دیا۔ اس موقعہ پر مولانا رسول شاہ نے بحیثیت واعظ وہ نکات اور دقایق بیان کئے کہ لوگ عش عش کر اٹھے بالخصوص نعت خوانی میں، جو اہل کشمیر کا طرۂ امتیاز ہے، مولانا رسول شاہ کا کشمیر میں ثانی نہ تھا۔ علاوہ ازیں بقول صاحب سرّ الواعظین مولانا رسول شاہ والد محترم

ہی کی زندگی میں سرینگر کے مضافات میں جا کر لوگوں کو رشد و ہدایت سے مستفیض کیا کرتے تھے۔ آپ کا وعظ عموماً قرآن و حدیث اور اسوۂ رسولؐ پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ روایت کے مطابق سورۂ الملک اور سورۂ الرحمٰن کی تفسیر متواتر آٹھ برس تک بیان کرتے رہے اور ان میں وہ نکات اور باریکیاں پیدا کیں کہ عقول حیران رہ جاتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دینیات و فقہ کا دریا ہے جو کہیں رکنے پر نہیں آتا۔ اسی طرح حدیث کے سلسلے میں شیخ علی[1] ابن سلطان محمد قاری ہروی متوفی ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) کی چہل حدیث کی شرح مسلسل نو برس تک منبر پر مسلمانوں کو سناتے رہے۔

مولانا رسول شاہ کے معاصر کشمیر میں مسلمانانِ کشمیر طرح طرح کی فضول رسوم و بدعات میں مصروف تھے۔ مولانا رسول شاہ نے پند و نصائح کے ذریعہ بہت حد تک ان کا خاتمہ کیا۔ مولانا کے وقت میں ایک فروعی مسئلہ شادی بیاہ کے موقعوں پر تقسیم شیرینی کا تھا۔ بالعموم لوگ اس موقعہ پر چھین جھپٹ سے کام لیا کرتے تھے۔ مولانا نے عمل اور سنت رسولؐ سے ثابت کر دیا کہ تقسیم شیرینی کا مہذب اور مسنون طریقہ حاضرین مجلس میں اشیائے خوردنی کی چھین جھپٹ میں نہیں بلکہ انہیں مناسب طریقہ

---

[1] نورالدین شیخ علی بن سلطان محمد افغانستان کے شہر ہرات کے رہنے والے تھے اور اسی مناسبت سے ہروی کہلاتے ہیں۔ مذہباً حنفی تھے اور مکہ شریف کو اقامت کیلئے چن لیا تھا۔ مسلک حنفی کے دفاع میں امام شافعیؒ اور امام مالکؒ پر جو ہاتھ لٹکا کر نماز پڑھتے ہیں زبردست اعتراضات کئے ہیں اور اس موضوع پر ایک رسالہ بھی تالیف کیا ہے۔ ۱۰۱۴ھ یا ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۵ء یا ۱۶۰۷ء) میں مکہ معظمہ میں وفات پا گئے۔ علمائے مصر نے جونہی وفات کی خبر سنی ہزاروں کی تعداد میں جامعہ ازہر میں مجتمع ہو کر آپ پر نماز غائبانہ پڑھی۔ ملا علی قاری بہت سی کتابوں کے مؤلف ہیں اور عرف عام میں ملا علی قاری ہروی کے نام سے مشہور ہیں۔

سے تقسیم ہی ہے۔ ایسا کرنے میں اگرچہ آپ کی شدید مخالفت کی گئی۔ گالی گلوچ سے بھی
اجتناب روا نہ رکھا گیا، عدالتی مقدمات تک میں پھنسایا گیا۔ تاہم بلا جھجک اور روک
ٹوک کے آپ لوگوں کی سماجی اصلاحات میں ہمہ تن مصروف رہے۔ لوگوں کو شادی
بیاہ کے موقعوں پر رسومات بیجا اور فضول خرچیوں سے بچنے کی تلقین کی۔ مولانا
کی ذاتی آمدنی کا بیشتر حصہ یتیموں، بیواؤں اور صاحبانِ ضرورت کی دستگیری پر خفیہ طور
پر صرف ہوتا تھا۔ لیکن ان سب میں مولانا رسول شاہ کا عظیم ترین کارنامہ اہلِ کشمیر
اور بالخصوص مسلمانوں کو علومِ جدیدہ کی اہمیت اور مستقبل میں اسکے رواج سے روشناس
کروانا ہے۔ اس موقعہ پر بھی متعصب اور قدیم خیالات کے اشخاص کے ذریعہ مولانا
کی مخالفت ہوئی۔ لیکن پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتے رہے ؎

ہوا مخالف ہے گرچہ لیکن، چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش حق نے جس کو دئے ہیں انداز خسروانہ

مولانا رسول شاہ میانہ قد کے ایک وجیہہ اور خوبصورت بزرگ تھے۔ چہرہ سے
وقار اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ سر بڑا تھا۔ داڑھی کو خضاب کیا کرتے تھے۔ آپ کے زمانے
میں لوگ حقہ اور بیڑی سگرٹ سے عموماً اجتناب کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا حقہ
کی تقریباً حرمت کے قائل تھے۔ اس لئے جدھر سے بھی گذر ہوتا لوگ حقہ اٹھا کر
مخفی جگہوں میں رکھ دیا کرتے تھے۔ آپ کی مجلس میں انتہائی درجے کی خاموشی ہوا
کرتی تھی۔ لباس میں اچکن، شرعی پاجامہ اور سر پر سفید یا گول دستار پہننا زیادہ
پسند کرتے تھے۔ محافل وعظ کے موقعہ پر کامدار مائل بہ سبزی چوغہ جسم پر ہوتا تھا۔
موسم سرما میں پشمینہ کا دوشالہ اوڑھتے تھے۔

استغنا اور بے نیازی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک موقعہ پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ
والئی ریاست جموں و کشمیر نے سرکار کے خزانۂ عامرہ سے ایک معقول رقم بطور وظیفہ دینا

چاہی لیکن آپ نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ خدا پر اُن کا بھروسہ ناقابل تزلزل ہے۔ نہ ہی میرے لئے کمائی وافی ہے۔

زندگی میں مولوی رسول شاہ نے جو رفاہی امور انجام دیئے ان میں عالی مسجد واقع عیدگاہ کی تعمیر و ترمیم ہے۔ اس کے علاوہ جامع مسجد سرینگر کشمیر اور دیگر مساجد کی مرمت کا بھی آپ نے بیڑا اٹھایا تھا۔ سرینگر کشمیر کی متعدد خانقاہیں، جن میں خانقاہ نقشبندیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے' آپ کی مساعی سے مرمت پذیر ہوئیں۔

اپنے وقت میں میرواعظ مولانا رسول شاہ عربی و فارسی کے جید عالم تھے۔ اس لئے شاگردوں اور تشنگانِ علم کی جس قدر تعداد آپ کو ملی، وقت کے کسی عالم کو نصیب نہ ہوسکی۔ مولانا کے تلامذہ اور شاگردوں میں قابل ذکر ہستیاں حسب ذیل ہیں:-

خواجہ حسن شاہ نقشبندی، خواجہ محمد شاہ نقشبندی، میر محمد شاہ قادری، میر محمد یوسف کنتھ (صفا کدل)، میر بہاؤ الدین قادری، میر محمد فاضل کنٹھ، مولوی حسن شاہ واعظ، مولوی ضیاء الدین (مفتی خانقاہ معلی۔ والد ماجد پروفیسر مفتی جلال الدین صدر مفتی کشمیر)، مولوی محمد حسن، مفتی محمد شاہ سعادت، مولوی احمد اللہ (مفتی حاجی)، مفتی محی الدین جامعی، مولوی غلام محمد لولابی اور حافظ محمد حسن مرحوم (امام مسجد گاڈہ یار زینہ کدل، سرینگر کشمیر)۔

انہیں سے مفتی محمد شاہ سعادت، مورخ کشمیر اورینٹل کالج انجمن نصرۃ الاسلام، سرینگر کشمیر میں مئی سنہ ۱۹۲۱ء سے اگست سنہ ۱۹۴۶ء تک راقم کے ساتھ بحیثیت معلم رفیق کار رہے۔ مفتی محمد شاہ سعادت کا انتقال ۷۲ برس کی عمر میں اتوار ۶ رجب سنہ ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۵۳ء کو ہوا[1]۔

---

[1] غالباً سنہ ۱۹۵۴ء کے رسالہ گلریز سرینگر میں "ذکرِ سعادت" کے عنوان سے راقم کا سب سے پہلا مضمون مفتی محمد شاہ سعادت کے احوال و کوائف اور ان کی تصانیف پر شائع ہوا تھا۔ مفتی محمد شاہ سعادت پر مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو "مفتی محمد سعادت" از محمد امین رفیقی، ہمارا ادب 'شخصیات' نمبر ۸۵-۱۹۸۴ء ص ص (۲۸۶-۲۸۸)۔

میرواعظ مولانا رسول شاہ اپنے والد بزرگوار حاجی محمد یحییٰ واعظ کی طرح صاحب تصانیف بھی تھے۔ لیکن زندگی میں گوناگوں مصروفیات کے باعث ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ تاہم ان میں السَّیفُ المَسلُولُ عَلیٰ مَن خَالَفَ قَولَ الرَّسُولِ (قولِ رسولؐ کے مخالف پر سونتی ہوئی تلوار) اور کبریت احمر کی عربی شرح ہے۔ "السَّیفُ المَسلُولُ عَلیٰ مَن خَالَفَ قَولَ الرَّسُولِ" اُن اشخاص کی تردید میں ہے جو شادی بیاہ کے موقعوں پر مٹھائی تقسیم کرنے کی بجائے چھین جھپٹ کے قائل ہیں۔ یہ رسالے میرواعظ خاندان میں محفوظ ہیں مگر عملی طور پر کسی کی نظر سے نہیں گذرے ہیں۔ البتہ سِرُّالواعظین کے مؤلف میرواعظ مولانا عتیق اللہ مرحوم نے ان کا تذکرہ کیا ہے (ملاحظہ ہو ماہنامہ نصرۃ الاسلام خصوصی شمارہ ۱۹۸۱ء بیادگار حضرت میرواعظ مولانا رسول شاہ رحمۃ اللہ علیہ صفحہ ۱۳)۔

میرواعظ مولانا رسول شاہ کے چار فرزند تھے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام مولوی محمد حسن تھا۔ مولوی محمد حسن عالم باعمل اور قرآن و حدیث کے متبحر عالم تھے۔ اہلحدیث (عام محاورہ میں شافعی مذہب) مسلک سے تعلق تھا۔ سعادت حج سے دوبار مشرف ہوئے تھے۔ ۴۲ برس کی عمر میں رحمت حق ہو گئے۔ مولانا رسول شاہ کے دوسرے اور نامور فرزند مولانا محمد یوسف شاہ صاحب تھے۔ آپ کا تعلق بڑے بھائی کے برعکس مسلک حنفی سے تھا۔ آپ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مولوی فاضل (آنرز ان عربک) ہونے کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل بھی تھے۔ انتہائی صالح، نیک اور متقی تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنے چچا مولوی احمد اللہ صاحب المعروف بہ اُمہ صاحب کی وفات حسرت آیات پر مرحوم مولانا عتیق اللہ صاحب کے ایما پر منصب میرواعظ سنبھالا اور جولائی سنہ ۱۹۴۷ء تک یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے موقعہ پر پاکستان چلے گئے۔ اور وہیں پر (اسلام آباد، پاکستان) میں ۱۶، رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۱ھ (جمعہ ۵، اکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء) کو بہ عمر ۸۰ برس، بائیس سال داعیِ

اجل کو لبیک کہہ گئے۔ کشمیری زبان میں بیان الفرقان المعروف بہ تعلیم القرآن کی تفسیر قرآن آپ سے یادگار ہے اور زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ مولانا رسول شاہ صاحب کے باقی دو فرزندوں میں مولوی محمد یحییٰ صاحب اور مولوی محمد شاہ صاحب تھے۔ ان دونوں کا حال ہی میں انتقال ہو چکا ہے۔ دونوں زندگی میں انجمن نصرۃ الاسلام کے جنرل سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ خدا ان سب کو مرحوم و مغفور کرے (آمین)۔

میرواعظ مولانا رسول شاہ صاحب چند روز کی مختصر سی علالت کے بعد جمعہ ۱۱ رجب المرجب ۱۳۲۷ھ (۳۰ جولائی ۱۹۰۹ء) کو خدا کو پیارے ہو گئے۔ مختلف شعراء نے مراثی کہے، ان میں ہیڈ ماسٹر صادق علی خان کا مرثیہ قابل ذکر ہے۔ ایک عقیدتمند فارسی دان پنڈت نے مولانا کی وفات پر یہ تاریخی شعر کہا ہے ؎

تمکین و تعلیم و رضا، علم و عمل، صدق و صفا

ہم زینت اہل ذکا، بے سر شدند از بس جفا

کشمیر کے مایہ ناز سپوت مولانا محمد انور شاہ کشمیری متوطن دیوبند نے عربی نظم میں مولانا رسول شاہ کی وفات پر یہ مرثیہ کہا ہے جو علاوہ مرثیہ کے مولانا کی تاریخ وفات کا بھی حامل ہے۔ عربی مرثیہ مع اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

اتانی ما نہانی عن رقاد   وواعدنی علی امر السہاد

(ایسی خبر میرے پاس آگئی جس نے مجھے نیند سے روک دیا اور بیداری کا وعدہ کیا)

فبانت لیلۃ مرودۃ لی   اکابدہا علی نحس المراد

(میری رات ایسی گذری کہ میں اس میں ناقص مراد کی تکالیف جھیل رہا تھا)

بمنسجم و مضطرم اتیحا   من العین القذیۃ والفواد

(دل اور آنکھ پر لگاتار آنسو اور جلن تھی جو تنکے کی طرح لگ گئی تھی)۔

فما صبر لہم قد لہم   وامر فیہ تہدیم العماد

(ایک چھا جانے والے غم کے لئے صبر نہ تھا اور ایک معاملہ کیلئے جس میں ستون کا انہدام تھا)

ذهاب سری عصر زین قوم — له منن علیٰ سایر وغاد

(یہ اہم معاملہ اور عم زمانے کے سردار اور زینت قوم کی رحلت تھی جس کے صبح اور شام کو چلنے والے شخص پر احسانات ہیں)۔

خطیب الخلق غطریف شریف — یزوّدُ کلھم زاد المعاد

(یہ رحلت کرنے والا قوم کا مقرّر، سردار اور شریف تھا جو سب کو آخرت کا توشہ دے رہا تھا)

اذا ما اھتم مرء فی مناہ — فان مناہ فی امر العباد

(جب بھی کوئی آدمی اپنی آرزو کا اہتمام کرے تو مولانا کی آرزو یقیناً امرِ عباد میں تھی)۔

تَقَضّیٰ عُمرہٖ یھدی البَرایا — یحدّثُھم اَحادیث الرَّشادِ

(آپ نے اپنی عمر مخلوق کی ہدایت میں اس طرح گذار دی کہ لوگوں کو رشد کی احادیث سناتے رہتے)

فوَفَی النّاسُ فِی قَولٍ مُطَاعٍ — وَوَافاہُ الخلائقُ وَھُوَ ھادِ

(لوگوں نے قابل اطاعت قول میں حق وفا ادا کر دیا اور مولانا نے بھی ہدایت کے معاملے میں مخلوق سے وفا کی)

وَاَنھیٰ العُصرَ فِی عَمَلٍ وَعِلمٍ — عَلیٰ ھَدیٍ وَسَمتٍ مِن سَدادِ

(آپ نے علم و عمل، ہدایت اور درستی کی سمت میں اپنا زمانہ ختم کر دیا)۔

جَزیٰ اللّٰہُ الکَرِیمُ جَزاءَ خَیرٍ — لَہُ وَاللّٰہُ حَسبُ الاِعتمادِ

(اللہ کریم آپ کو جزائے نیک دے، اور اللہ ہی اعتماد کے لئے کافی ہے)

لحیٰ (۵۴) وراح مغفوراً (۱۳۲۷) تعالیٰ — مع الاعلیٰ الرفیق وخیر ناد

(آپ بحساب حروف جمل "لحیٰ و" کے اعداد (۵۴ برس) زندہ رہے اور "مغفوراً" (بخشے گئے) کے اعداد (۱۳۲۷) کے مطابق سنہ ہجری میں رفیق اعلیٰ (خدا تعالیٰ) کی بہترین مجلس میں جا پہنچے۔

اور اب آخر پر مولانا رسول شاہ کی عربی تحریر کا نمونہ تبرکاً نقل کیا جاتا ہے۔ یہ نمونہ ان کی غیر مطبوعہ عربی تصنیف "اَلسَّیفُ المَسلُولُ عَلیٰ مَن خَالَفَ قَولَ الرَّسُولِ"

کے ابتدائی اوراق سے ماخوذ ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ معلی الحق ومُعلنہ
وموھی الباطل وموھنہ۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا
محمد الآمر بالعدل والانصاف، الناھی عن الظلم والنھب
والاعتساف، وعلیٰ اھل بیتہ الطیبین الطاھرین واصحابہ
الاکرمین المکرمین وعلیٰ حملۃ علومہ الذین قاموا
لنصرۃ الدین، فنفوا عنہ تحریف المبطلین وتاویل الجاھلین
تحقیقاً لما اخبر بہ الصادق المصدق الامین، صلی اللہ
وسلم علیہ وعلیھم اجمعین، فی کل وقت وحین۔ اما بعدُ
فیقول العبد الراجی من اللہ التوفیق وحسن القبول
غلام رسول الواعظ فی بلدۃ الکشمیر عفا اللہ عما جناہ
واستعملہ فیما یحبہ ویرضاہ قد جری النزاع بینی
وبین لبعض اھل ھذہ البلدۃ فی مسئلۃ انتھاب
النثار الذی شاع لبعد عقد النکاح فی ھذا الاعصار
حتی کان لبعض الاحداث یبالغون فیہ ویفرون ویو
ذون المسلمین ولا یبالون ویعتدون علیھم ولا یستحیون
ویضحکون فی وقت الانتھاب ویلعبون ویثیرون الفتنۃ
ویشوشون القلوب ویقطعون الاذیال ویستبقون الجیوب
فلما شاھدت ذالک قرأت فی بعض الجامع وعظی ومجالس
درسی ان النثار لبعد عقد النکاح لم یثبت فی حدیث
من الاحادیث الصحاح وما یروی من ذالک فی بعض الاحادیث،

فهی اما موضوعة او ضعیفة فلا یثبت بها حکم من الاحکام

الشریعة الشریفة وامرت الناس بالتقسیم بین الحاضرین

اذ لا یوجد فیه شئ من محظورات الدین کما امر بذالک

فی کتاب غنیة الطالبین سیدنا وسندنا شیخ الاسلام

ومقتدای العلماء الاعلام واولیاء العظام علم الھدی

علامة الوری القطب الربانی والفرد النورانی الجامع

لعلم الباطن والظاھر ابو محمد محی الدین السید عبد القادر

الجیلانی رضی اللہ عنه وارضاہ عنا وسنتلو علیک

عبارۃً "۔

عبارتِ مذکورہ کا اردو ترجمہ:

(مہربان اور رحم والے خدا کے نام سے۔ جملہ حمد و ثنا حق کے سربلند کرنیوالے

اور باطل کو بیکار اور کمزور کرنے والے خدا کے لئے ہیں۔ ہمارے آقا

وسردار محمدؐ پر درود و سلام ہے جو عدل و انصاف کے آمر (حکم دینے والے)

اور لوٹ اور ظلم و جور سے مانع ہیں۔ یہی درود و سلام آپ کے پاکیزہ

اہل خاندان اور معزز و مکرم صحابہ کرام پر بھی ہو۔ اور ان لوگوں پر بھی جو

حاملین دین اور اس کے حمایتی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی مساعی سے

جھوٹوں کی قلم زنی اور جہلاؑ کی تاویل (اپنی تشریح) کو غلط ٹھہراتے ہوئے

وہ چیز ثابت کی جو صادق و امین پیغمبرؐ سے مروی ہے۔ آپ اور ان منسب

پر ہر وقت خدا کا درود و سلام ہو۔ اس حمد و صلوٰۃ کے بعد خدا سے

امیدوار توفیق و حسن قبول غلام رسول واعظ بلدہ کشمیر (اللہ اسے

غلط کاموں سے معاف کرے اور اپنی پسند و رضا کے کام میں لائے)

کہتا ہے کہ میرے اور اس شہر (ملک) کے بعض اشخاص کے مابین اُس تبرّک کے بکھیرنے میں جھگڑا پیدا ہو گیا ہے جو انعقادِ نکاح کے بعد ملک میں اس زمانے میں رائج ہے۔ چنانچہ بعض نوعمر اس معاملہ میں حد سے زیادہ مبالغہ کرتے ہوئے تیزی سے بھاگ کر مسلمانوں کو ایذا دیتے ہیں اور ذرّہ بھر پرواہ نہیں کرتے بلکہ لوٹ اور چھین جھپٹ کے موقعہ پر نہ صرف بے حیائی سے ہنستے اور کھیلتے ہیں بلکہ فتنہ برپا کر کے گریبان اور دامن پھاڑتے ہیں اور اس طرح فتنہ اور باعث پریشانیٔ قلوب ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر میں نے اپنے وعظ و درس کی بعض محافل میں پڑھ دیا کہ عقدِ نکاح کے بعد شرینی بکھیرنا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ اور اس سلسلے میں جو بعض احادیث وارد ہیں۔ وہ یا تو من گھڑت ہیں اور یا پھر کمزور ہیں اور ان سے شریعت شریفہ کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر میں نے حاضرین میں تقسیم کا حکم دے دیا۔ کیوں کہ اس میں کوئی دینی ممانعت نہیں ہے۔ چنانچہ یہی بات ہمارے آقا اور سندِ شیخ الاسلام مقتدائے علماءُ و اولیاء، قطبِ ربّانی، جامع ظاہر و باطن ابو محمد محی الدین شیخ سیّد عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی تصنیف "غنیۃ الطالبین" میں بھی مذکور ہے اور ہم یہ عبارت عنقریب آپ کے روبرو پیش کریں گے)"۔

نموش دیومینی

چراغ حسن حسرت

دادی پونچھ کو اس بات پر فخر ہے کہ اُس نے اپنی گود میں چراغ حسن حسرت جیسے مایہ ناز ادیب، بلند پایہ شاعر اور مقبول و معروف صحافی کو پالا اور جوان کیا جو آگے چل کر ملک کی ادبی و صحافتی دنیا میں "چراغ" بن کر روشن ہوا۔ ویسے تو حسرت صاحب کا سارا خاندان ہی[1] ادبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ آزادی سے پہلے

---

[1] چراغ حسن حسرت کے نانا بھی بڑے اچھے شاعر تھے۔ بھائی سراج الحسن آزادی سے پہلے پونچھ سے "المجاہد" اور "صادق" نامی اخبار نکالتے رہے ہیں۔ تیسرے بھائی ضیاء الحسن کتابت کیا کرتے تھے اور ادب کا ذوق رکھتے تھے اُن کے بھانجے محمود الحسن محمد آج بھی پونچھ میں اپنی اس خاندانی ادب نوازی کی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور بڑی عمدہ شاعری کرتے ہیں۔

پونچھ جیسے دور افتادہ پہاڑی علاقے میں اردو ادب کے فروغ میں اس خاندان کا بڑا دخل رہا ہے لیکن جس تندہی اور لگن کے ساتھ حسرت نے ادبی خدمات اور صحافتی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ اُن ہی کا حصہ ہیں۔ حسرت نے اپنے قلم کے جوہر اگرچہ کلکتہ دہلی اور لاہور میں بیٹھ کر دکھائے لیکن انہوں نے ادبی سفر کا آغاز پونچھ کے ادبی ماحول سے متاثر ہو کر ہی کیا تھا۔ پونچھ کے صحافی آنجہانی دیانند کپور نے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ مولانا جب پونچھ میں قیام کرتے تھے تو بلا ناغہ اُن کے اخبار "پربھات"[1] کے دفتر میں آکر ادبی تذکرے و شعروشاعری کے چرچے کیا کرتے اور اپنا تازہ کلام بھی سُنایا کرتے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کے فن اور شخصیت پر بات کرنے سے پہلے آیئے ان کے حالات زندگی پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

مولانا چراغ حسن حسرت کے والد کا نام لالہ کشمیر چند کپور اور دادا کا نام لالہ فقیر چند کپور تھا جو تبت خورد میں سرکاری ملازم تھے لیکن لالہ کشمیر چند کپور عہدِ شباب میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا اسلامی نام شیخ بدرالدین رکھ کر اپنے وطن سے ہجرت کر کے تحصیل بارہمولہ کے گاؤں بمیار میں آ گئے یہاں شیخ صاحب نے جاگیر کہٹالی کے منشی حسن علی خان کی صاحب زادی سے شادی کر لی۔

مولانا چراغ حسن حسرت کی ولادت ۱۹۰۲ء میں جاگیر کہٹالی کے

---

[1] پربھات پونچھ سے شایع ہونے والا پہلا اخبار تھا جس کے مالک و ایڈیٹر دیانند کپور تھے۔

موضع بمیار میں ہی ہوئی۔ یہ گاؤں بارہمولہ قصبہ سے چند میل کے فاصلے پر جہلم ویلی روڈ کے قصبہ رام پور کے عین اُس پار سربفلک پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے حسرت صاحب نے زندگی کے پہلے نو سال اسی گاؤں میں گزارے یہاں حسرت کو نانا منشی حسن خان نے گود لے لیا تھا اور وہ اُن ہی کے پاس رہتے تھے۔ منشی صاحب کے کٹھائی کے جاگیردار سلطان محمد خان کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ بھی ان کی بڑی قدر کرتا تھا لیکن سلطان محمد خان کی وفات کے بعد کٹھائی میں منشی صاحب کا وہ دبدبہ و رتبہ نہ رہا جو پہلے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منشی صاحب کی کٹھائی کی جاگیر سے دلچسپی ختم ہوگئی اور انہوں نے کٹھائی کو خیر باد کہا اور واپس پونچھ چلے آئے جب منشی صاحب پونچھ دربار میں ملازم ہوگئے تو انہوں نے اپنے سارے خاندان کو پونچھ بلا لیا۔ اس طرح سنہ ۱۹۱۱ء چراغ حسن حسرت اور ان کا کنبہ بھی پونچھ آگیا۔ اُس وقت آپ نو سال کے تھے۔

چراغ حسن حسرت نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بدرالدین اور نانا منشی علی حسن خان سے حاصل کی۔ منشی علی حسن خان اپنے زمانہ کی اہم ادبی شخصیت تھے۔ وہ اعلیٰ پایہ کی شاعری بھی کرتے تھے۔ حسن ان کا تخلص تھا۔ ان کے گھر میں ادبی کتابیں اچھی خاصی تعداد میں تھیں اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کے گھر میں ادبی محفلوں کا اہتمام بھی ہوتا رہتا تھا۔ ان باتوں کا حسرت کی طبیعت پر گہرا اثر پڑا اور بچپن سے ہی اُن کا رجحان ادب کی طرف ہوگیا۔

چراغ حسن حسرت پہلے پہل کچھ دنوں کے لئے سٹیٹ ہائی سکول[1]

---

[1] تاریخ اقوام پونچھ۔ مصنف منشی محمد دین فوق۔

پونچھ میں داخل ہوئے۔ پھر اسلامیہ سکول پونچھ چلے گئے اُن دنوں منشی صادق
علی خان پونچھ اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے وہ بڑے ادب نواز شاعر اور
نکتہ رس تھے وہ اکثر سکول میں شعر و ادب کی محفلوں کا اہتمام کیا کرتے تھے،
ان محفلوں نے حسرت کے اندر چھپے ہوئے ادیب کو سامنے لانے میں بڑا اہم رول
ادا کیا اور یہاں سے حسرت شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔

حسرت جب چھٹی جماعت کے طالب علم تھے تو والد شیخ بدرالدین
کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ حالات نے اُنہیں ایسا گھیرا کہ آٹھویں پاس کرنے
کے بعد ملازمت اختیار کرنی پڑی تاکہ گھر چلا سکیں۔ حسرت اسلامیہ سکول
پونچھ میں ہی مدرس ہو گئے لیکن طبیعت میں تلوّن اتنا تھا کہ کہیں چین نہ ملتا
تھا وہ کچھ بننا چاہتے تھے وہ کچھ کرنا چاہتے تھے جو پونچھ میں ممکن نہ تھا۔ اسی
دوران ہیڈ ماسٹر سے کسی بات پر ان بن ہو گئی۔ حسرت نے نوکری چھوڑ دی
اور شملہ چلے گئے۔[1]

شملہ جاتے ہی آپ کو بشپ کاٹن سکول میں ملازمت مل گئی اور
بحیثیت مدرس مقرر ہو گئے یہاں آپ کافی عرصہ تک پڑھاتے رہے اور اس
کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ ملازمت کے دوران ہی انہوں نے
منشی فاضل اور ایف اے کے امتحانات پاس کر لئے۔ بی اے کی تیاری
کر رہے تھے کہ جی شملہ سے بھی اُکتا گیا[2] چنانچہ ۱۹۲۵ء میں شملہ سے کلکتہ چلے گئے

---

[1] سراج حسن۔ مضمون "میرا بھائی" جو ہفت روزہ صادق میں ۲۹ جون ۱۹۶۲ء کو شائع ہوا۔ [2] تاریخ اقوام پونچھ۔ صفحہ ۴۲۹۔ منشی محمد دین فوق۔

حسرت کلکتہ میں اخبار "عصر جدید" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ پھر "آفتاب" کے نام سے اپنا ادبی و علمی رسالہ جاری کیا۔ کچھ عرصہ بعد "نئی دنیا" والوں نے آپ کو اخبار کی ادارت سونپ دی۔ یہاں حسرت نے ایک سال ملازمت کی پھر چند دوستوں کے تعاون سے "جمہور" نام کا ایک اخبار شایع کیا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ اسی دوران کچھ دنوں کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیغام" میں بھی کام کیا۔ یہ وہ دور تھا جب مولانا حسرت کی صحافتی قابلیت کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بج رہا تھا۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں مولانا ظفر علی خان کلکتہ گئے۔ انہوں نے چراغ حسن حسرت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ جب ملاقات ہوئی تو اتنے متاثر ہوئے کہ وہ حسرت کو کلکتہ سے اپنے ساتھ لاہور لے آئے۔

لاہور[1] میں آپ نے سب سے پہلے اخبار "زمیندار" میں لکھنا شروع کیا پھر روزنامہ "انصاف" سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کے دارالاشاعت پنجاب میں ملازم ہو گئے اور چار سال تک وہاں کام کیا۔ اسی دوران لاہور کے کئی مسلم اخبارات کے لئے بھی لکھتے رہے پھر اخبار "احسان" سے منسلک ہوئے جو کہ اُس زمانہ میں ہندوستان کے بہترین مسلم روزناموں میں شمار ہوتا تھا۔ مولانا روزنامہ "احسان" کے مستقل کالم، جو مطائبات کے عنوان سے شایع ہوتا تھا، میں "سندباد جہازی" کے فرضی نام سے مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے۔

---

[1] تاریخ اقوام پونچھ۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو مولانا چراغ حسن[1]
حسرت نے فوج میں ملازمت اختیار کرلی اور فوجی گزٹ میں اردو سکشن کے
انچارج ہوگئے۔ ملازمت کے دوران حسرت سنگاپور اور ملایا بھی گئے اور قابلیت
کی بدولت چند ہی سالوں میں میجر ہوگئے۔ لیکن لڑائی کے بعد سبکدوش ہوگئے
اور ملایا سے واپسی پر پھر پونچھ آگئے اور ایک عرصہ تک پونچھ میں رہے جہاں
اُن کا کنبہ رہتا تھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو آپ لاہور چلے گئے اور
پھر اپنے کُنبے کو بھی وہاں ہی بُلا لیا۔[2]

پاکستان بننے کے بعد مولانا چراغ حسن حسرت "تہذیب نو" "پنجابیت"
"امروز" اور آخر میں کچھ عرصہ "نوائے وقت" کے ایڈیٹر رہے۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں
ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور ۲۶ جون سنہ ۱۹۵۵ء کو حسرت نے لاہور میں اس
جہانِ فانی سے کوچ کیا۔[3]

---

[1] ہفت روزہ "صادق" میرپور حسرت نمبر ۲۹ جون سنہ ۱۹۶۴ء۔

[2] اُن کا آبائی گھر آج بھی پونچھ کے محلہ کامسر میں موجود ہے جہاں ایک رفیق جی کُنبہ آباد ہے۔

[3] اِس وقت حسرت کا اکلوتا بیٹا ظہیر جاوید راولپنڈی میں مقیم ہے۔ اور پاکستان ٹی وی سے وابستہ ہے لیکن اپنا اخبار بھی نکالتا ہے۔ مولانا کے تین بھائی اور تھے جن میں سراج حسن سراج سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے پونچھ سے اخبار "صادق" نکالتے تھے بعد میں میرپور چلے گئے اور وہاں سے یہ اخبار نکالتے رہے۔ سنہ ۱۹۷۲ء میں انتقال ہوا۔ دوسرے بھائی ضیاء الحسن ضیاء تھے اور بڑے زبردست کاتب تھے انہوں نے ۱۹۷۲ء میں وفات پائی جبکہ تیسرے بھائی ریاض الحسن ریاض کا انتقال اسی سال (۱۹۸۶ء میں) باغ (پاکستانی مقبوضہ کشمیر) میں ہو گیا۔

سنہ۔ دیکھئے مضمون کا آخری صفحہ۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے اپنے ایک مقالے میں مولانا چراغ حسن حسرت کی ادبی و صحافتی زندگی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدائی دور کلکتہ میں بسر ہوا جہاں اُن کا قلم رنگ لایا اور اُنہیں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ دوسرا دور لاہور کے متعدد روزناموں میں ان کی مزاحیہ کالم نگاری کا دور ہے جو کم و بیش چودہ برس تک جاری رہا۔ اس میں "زمیندار" اور "احسان" کے صفحات سے لیکر "نیشنل کانگریس" کے اوراق تک حسرت کے بہار آفرین قلم سے رشک گلزار بنے رہے۔ تیسرا دور ان کی ہفت روزہ صحافت کا زمانہ ہے جس کی مدت پانچ برس سے زیادہ نہیں۔ پھر فوجی ملازمت کا دور آتا ہے جس میں حسرت نے اعلےٰ قسم کی اخبار نویسی کے تجربے کئے۔ پانچواں اور آخری دور روزانہ اخبار نویسی کا ہے یہ دور ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے اور "امروز" کی ادارت سے شروع ہو کر "نوائے وقت" کی کالم نگاری پر ختم ہوتا ہے

مولانا چراغ حسن حسرت اپنی پاکیزگی زبان اور شگفتگی بیان کے لئے بڑے مشہور تھے[۲۵] وہ خصوصی مقالہ نگاری میں منفرد، مزاحیہ کالم نویسی میں لاجواب، ترجمے میں طاق، شعر و سخن میں ماہر اور محاورۂ زبان کی پابندی میں قدامت پرست تھے۔ ہر لفظ، ہر محاورہ، ہر فقرہ جانچ تول کر لکھتے تھے۔ اُن کی زبان سادگی، شگفتگی اور برجستگی کے لئے بھی مشہور تھی۔ اُن کے قلم نے گلشن اُردو میں ایسے گلہائے رنگا رنگ کھلائے جن کی مہک تا ابد رہے گی وہ اپنی زباندانی کی بدولت ہر قسم کے اظہار میں کامیاب رہے۔ صحافت میں اُن کا یہ عالم تھا کہ

[۲۵] ہفت روزہ "صادق" (حسرت نمبر) میرپور۔ ۲۹ جون سنہ ۱۹۶۴ء

تن تنہا پورا اخبار شروع سے آخر تک مرتب کر سکتے تھے اور کمال یہ کہ اُن کے صحافتی رنگ پر ادبی جھلک غالب رہتی تھی۔ اُن کی تحریروں کو پڑھکر یہ سراغ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ اُن کا تعلق پونچھ جیسے علاقے سے ہو سکتا ہے۔

مولانا حسرت کی صحافتی مصروفیات نے ان کو تصنیف و تالیف کی جانب زیادہ توجہ کا موقع نہ دیا۔ ویسے تو حسرت نے بہت سی کتابیں لکھیں لیکن اپنے نام سے بہت کم شایع کیں۔ پھر بھی ان کی چند کتابیں یعنی "جدید جغرافیہ پنجاب"۔ "کیلے کا چھلکا"۔ "ہر دم دیدہ"۔ "مطائبات"۔ "پربت کی بیٹی"۔ "بغاوتِ عرب"۔ "کرنل لارنس کشمیر" کے علاوہ چند درسی کتابیں بھی موجود ہیں جن کو اہلِ ذوق آنکھوں پر رکھتے ہیں۔

مولانا چراغ حسن حسرت مانے ہوئے طنز نگار تھے۔ انہوں نے اخبار 'احسان' میں مطائبات کے عنوان سے 'سند باد جہازی' کے فرضی نام سے طنزیہ مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا جو نہایت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا تھا۔ حسرت کی ظرافت امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ اُن کی نگارشات میں ظرافت زیادہ اور طنز نسبتاً کم ملتا ہے۔ حسرت کی طنز مد مقابل کی چٹکیاں ضرور لیتی ہے۔ اُسے مجروح نہیں کرتی۔ اُن کی ظرافت کی دوسری خوبی ان کی وسیع تر معلومات تھیں۔ وہ بڑے گہرے مطالعہ کے بعد علم کی سنگلاخ چٹان سے ظرافت کے چشمے بہایا کرتے تھے۔ تیسری خوبی یہ تھی کہ بڑی برجستہ تشبیہہ دیتے تھے۔ وہ تشبیہہ اور تمثیل کے بادشاہ تھے۔ اِن کی طنز نگاری کی دو مثالیں پیشِ خدمت ہیں جو ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے شیرازہ میں شایع ہوئیں۔

"...... مارچ کی ادبی دنیا میں میراجی کی ایک نظم "سنگِ آستان" کے عنوان سے چھپی ہے۔ ہم اس سنگِ آستان سے سر پھوڑتے پھوڑتے تھک گئے تو گھبرا کے نیچے نوٹ کی طرف رجوع ہوئے لیکن وہ سنگِ خارا کی پٹّان سے کم نہ نکلا۔ ادبی دنیا میں اس قسم کے نوٹ لکھنے کے بجائے میراجی اپنی نظموں کے مفہوم سمجھانے کے لئے ایک نائٹ سکول کیوں نہیں کھول لیتے۔"

"........ ترقی پسند شاعروں[1] نے سب سے پہلے مزدور پر ہلّہ بولا تھا لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے مزدور تو قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ محنت اور سرمایہ داری، مزدور اور سرمایہ، مزدور کی رات، مزدور کی صبح، مزدور کی عید، مزدور کی دیوالی، مزدور کی بیٹی، مزدور کا باپ، ان سب موضوعوں پر تو ہمارے شعراء طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ اب مزدور کا ماموں، مزدور کا نانا، مزدور کا سالا، مزدور کا بہنوئی وغیرہ چند موضوع رہ گئے ہیں سو انہیں بھی کچھ دنوں میں ختم سمجھئے۔"..... ادھر[2] چند سال سے ترقی پسند شاعری کا بڑا غلغلہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس مال کی پیداوار زیادہ ہے اور کھپت کم۔ باقی رہا غلغلہ تو اُسے کوئی کیا کرے۔ اوڑھے یا بچھائے۔"

"....... بے قافیہ شاعری یا جدید شاعری عجیب چیز ہے۔ اگر راشد کی نظموں کو نکال دیا جائے تو اس صنف میں کام کی بہت کم چیزیں رہ جاتی ہیں۔ آپ نے اس انداز کی نظمیں نہ پڑھی ہوں تو راقم الحروف کے

---

[1]، [2] شیرازہ یکم ستمبر ۱۹۴۰ء

چند اشعار سُن لیجئے۔

سُنا ہے کہہ دیا انگور نے آلو بخارے سے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
یہ بھینسیں آہ یہ بھینسیں ——!
ہوا میں تیرتے ہیں قہقہے اُن کی جُگالی کے
کہا سوسن نے مچھر سے
کہ مری روح کا نغمہ میرے صندوق میں ہوگا ——!!

مولانا حسرتؔ ہندو دیومالا سے صرف واقف ہی نہ تھے بلکہ ہندی بھاشا سے بھی بڑی رغبت رکھتے تھے۔ انہوں نے سہل اُردو اور سہل ہندی کے امتزاج سے اپنی کتاب "پربت کی بیٹی" لکھی تھی۔ اس کتاب سے اُن کی نثر کا ایک اقتباس پیش ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ہلکی پھلکی افسانوی زبان کتنی خوبصورت اور شستہ تھی۔

"....... جب اماں نے دیکھا کہ اُس کا رُوپ، اور جوبن شوجی کے من سے ستی کی یاد کو نہیں مٹا سکا تو اُس نے سارا گہنا اُتار ڈالا۔ ست لڑے ہار کو یوں نوچ کر پھینک دیا کہ اُس کی رگڑ سے چندن کا لیپ آپ ہی اُتر گیا۔ کان کے بُندوں کو غصّے سے نوچا کہ کان لہولہان ہوگیا۔ پھولوں کے جھومر کو پاؤں تلے روند ڈالا اور ریشم کا شوخ جوڑا جس میں سونے کے تار گندھے ہوئے تھے اُتار کر درختوں کی بھوری چھال سے اپنے بدن کو ڈھانپ لیا اور گھربار چھوڑ کر سنسان جنگل میں جو آبادی سے دُور تھا کُٹیا بنا کر رہنے لگی

پر اس برن میں بھی اُس کے رُوپ کی چمک دمک کم نہیں ہوئی اور بھوری چھال میں اُس کا نکھرا ہوا جوبن یوں جھلکتا دکھائی دیتا تھا جیسے پچھلے پہر کے دھندلکے میں پو پھٹ رہی ہو......"

مولانا حسرت بہترین صحافی اور مانے ہوئے ادیب ہی نہیں تھے بلکہ شہرہ آفاق شاعر بھی تھے اُن کی غزلوں میں عاشقانہ پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ جس بھی مشاعرے میں شرکت کرتے اپنی شاعری کا سکّہ منوا کر ہی اُٹھتے تھے۔ حسرت نے بہت سی نظمیں اور غزلیں لکھیں لیکن کلام کا بیشتر حصّہ یا تو ناپید ہوگیا یا پھر منتشر حالت میں ہے۔ ذیل میں اُن کی غزلوں کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں

غمِ آرزو کو نہ زندہ کر دلِ بے خبر یہ وہ آگ ہے
جو سُلگ اُٹھی تو سُلگ اُٹھی جو دبی رہی تو دبی رہی

●

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

●

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

۱؎ تاریخ اقوام پونچھ۔ مصنّف منشی محمد الدین فوق۔

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سُنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سُنا ہوتا

●

اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے
ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

●

زندگی تو ہی مختصر ہو جا
شبِ غم مختصر نہیں ہوتی

●

شمعیں بجھنے لگیں کہرام ہے پروانوں میں
رُخِ روشن سے عیاں نورِ سحر ہے کہ نہیں

●

ڈرتا ہوں کہ اُس چشمِ فسوں ساز کی گردش
احساسِ تمنّا کو تمنّا نہ بنا دے

●

رات کی بات مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی

●

حسرت کو لے تو آئے تری بزمِ ناز میں
کمبخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

حسرت بڑے ہی ملنسار، شفیق، مہربان، یاروں کے یار اور دوستوں کے دوست تھے۔ وہ بڑے خوش مزاج آدمی تھے۔ جو بھی ایک بار ان کی محفل میں آجاتا ان کا مداح ہو جایا کرتا تھا۔ مولانا کی وفات پر ان کے ایک دوست جناب ظہیر بابر نے ماہنامہ "آج کل" دسمبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں مرحوم کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

اُن کے نظریات سے بہتوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی ذات سے وہی نفرت کر سکتا ہے جس کے دل میں کسی کے لئے بھی جگہ نہ ہو۔"

کرشن چندر مرحوم کا تعلق بھی پونچھ سے تھا اور وہ اُس زمانے میں پونچھ ہی میں ہوا کرتے تھے جب چراغ حسن حسرت نے لکھنا شروع کیا تھا۔ دیانند کپور (مرحوم) نے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ جب وہ اور حسرت اخبار "پربھات" کے دفتر میں بیٹھ کر ادبی تذکرے کیا کرتے تو کرشن چندر اُن کے قریب بیٹھ کر یہ سنا کرتے تھے۔ اس طرح کرشن چندر چراغ حسن حسرت کو بچپن سے ہی جانتے تھے۔ کرشن نے حسرت کا ایک خوبصورت خاکہ[1] لکھا تھا جس سے حسرت مرحوم کے مزاج اور ان کی طبیعت کے نئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اگر اس مقالے کا اختتام کرشن چندر کے اسی خاکے کے ایک اقتباس سے کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

"...... نام چراغ حسن حسرت لیکن احباب پیار سے "لیمپ حسن حسرت" کہا کرتے ہیں۔ کیوں کہ محفل چاہے کتنی بھی سونی اور ویران

---

[1] پہلی بار ۱۹۳۹ء میں یہ خاکہ شایع ہوا تھا۔ بعد میں آجکل دہلی کے ستمبر ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں بھی شایع کیا گیا تھا۔

کیوں نہ ہو یہ اپنی شگفتہ مزاجی، خوش کلامی اور بذلہ سنجی سے اُس میں اُجالا کر دیتے ہیں .... اصل وطن کشمیر ہے لیکن شکل وصورت کے اعتبار سے ہندوستان کے اصلی باشندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کے تن وتوش کو دیکھ کر شاعر لوگ انہیں پہلوان سمجھ لیتے ہیں اور پہلوان لوگ شاعر اور حقیقت میں یہ دونوں اپنی جگہ سچے ہیں۔ ....

حسرت کے مزاج میں تلوّن ہے۔ ہمیشہ ایک اخبار میں کام نہیں کر سکتے۔ ایک مکان میں نہیں رہ سکتے، ایک شہر، ایک صوبے میں نہیں ٹھہر سکتے ....

حسرت کی زندگی کا روشن ترین پہلو اُس کی آزادی ہے۔ جس بات کو وہ صحیح سمجھتا ہے اُس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اپنی صحافتی زندگی میں، میرا خیال ہے کہ اُس نے ایک بار بھی اپنے ضمیر کو دبانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ انفرادیت کا پجاری ہے اور جو اُس کی انفرادیت کے راستے میں حائل ہو وہ اُسے قطعاً اچھا نہیں سمجھتا چاہے وہ اُس کا کتنا ہی عزیز ترین دوست ہی کیوں نہ ہو۔— !''

○

نوٹ (از صفحہ ۵۶ حاشیہ) ظہیر جاوید کو کچھ عرصہ قبل پاکستان ٹیلی ویژن سروس سے برخاست کر دیا گیا اور تقریباً ۲½ سال نظر بند رکھا گیا۔ البتہ اُن کی صاحبزادی پاکستان ٹیلی ویژن میں بطور نیوز کاسٹر کام کر رہی ہے۔ ظہیر صاحب کا حکومت سے کوٹلی میں زمین کے ایک رقبہ پر مقدمہ چل رہا تھا جو انہوں نے جیت لیا اور یہ ۴ کنال زمین ان کے قبضہ میں آ گئی۔ انہوں نے کوٹلی میں ہی والد صاحب (حسرت) کے نام پر ایک اکیڈیمی قائم کی ہے۔ حسرت کے نام پر وہاں ایک مڈل سکول، ایک انٹر کالج اور ایک سٹریٹ بھی ہے۔ ظہیر صاحب نے راولپنڈی میں اپنا چھاپہ خانہ بھی کھول لیا ہے۔ تر کانجن (اوڑی) حسرت کی جائے پیدائش سے ۵ کلومیٹر دور نادی کے ایک نوجوان ادیب نذیر بونیاری، جو کہ حسرت پر تحقیق کر رہے ہیں، نے حسرت کے نام پر ایک لائبریری قائم کی ہے جس میں ایک ہزار کے قریب کتابیں اس وقت موجود ہیں۔ مذکورہ بالا باتیں انہوں نے ہی مجھے بتائی ہیں — (ایڈیٹر)

موتی لال ساقیؔ

یہ سال ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ شالیمار باغ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ فضا پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ بارہ دریوں کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ شبِ شالیمار کی پُر رونق تقریب نے مغل شہنشاہ جہانگیر کی یادوں کو نئی زندگی عطا کی تھی۔ جشنِ کشمیر کی تقریبات اگرچہ ساری وادی میں ہو رہی تھیں مگر اس تقریب کا انداز، اس کی سج دھج اور شان دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی تھی۔ تقریب کی ایک کڑی کے طور پر مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ مشاعرہ سننے کے لئے لوگ بارہ دری کے آس پاس بیٹھے تھے۔ میر غلام رسول نازکیؔ مشاعرے کے منتظم کی حیثیت سے سٹیج پر موجود تھے اور بخشی غلام محمد بھی تشریف لا چکے تھے۔ اب دیر کس بات کی تھی۔ یہ اوقات مشاعرہ بخشی صاحب کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہوتا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوا۔ سب لوگ کسی کے لئے چشم براہ تھے۔ کسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ مہتمم حضرات ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے تھے۔ آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ پھرن پہنے کندھوں پر لپٹے کی چادر ڈالے اور سر کو کشمیری ٹوپی سے ڈھانپے ایک شخص آہستہ آہستہ سٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سب سے پہلے بخشی صاحب آگے بڑھے اور اس کے بعد تقریبات

صمد میر
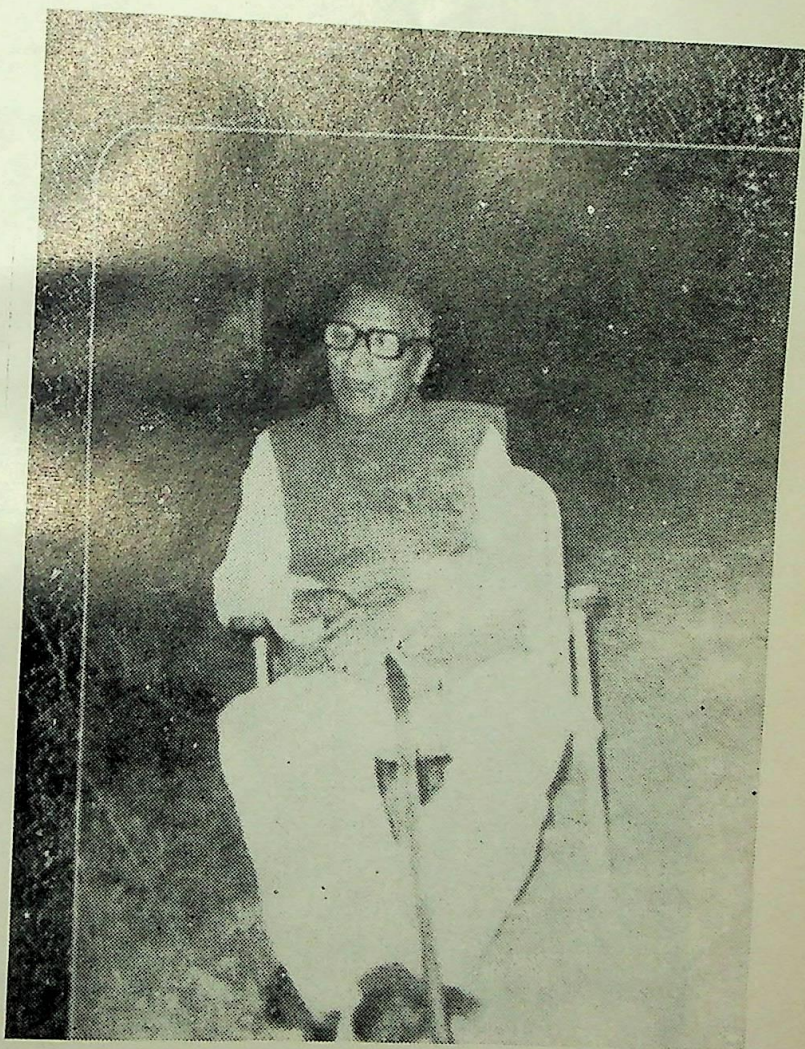
کشیپ بندھو

کو منظم کرنے والے دوسرے لوگ۔ مہمان کا استقبال کافی گرمجوشی سے ہوا اور بارہ دری پر اُسے صدارت کے لئے براجمان کیا گیا۔ بخشی صاحب اس کے پہلو میں بیٹھ گئے اور ساتھ ہی مشاعرے کی کاروائی کا اعلان کیا گیا۔ میں نے دور سے ہی مہمان کو پہچان لیا کیوں کہ میں نے بچپن سے ہی اُسے بار بار دیکھا تھا۔ میرے ننھیال میں اکثر باتوں باتوں میں اس کا ذکر چھڑ جاتا تھا کیوں کہ اس کا وہاں اور اس کے اڑوس پڑوس میں آنا جانا رہتا تھا۔ یہ خاص مہمان تھے صمد میر جنہیں قریب سے جاننے والے میر صاؔب کے نام سے پکارتے تھے۔ اس مشاعرے میں میر صاحب نے اپنا ایک پرانا گیت سنایا۔ جس کا مطلع اس طرح ہے:۔

نہ چھُ کنہٕ گرٕ بس نہ چھُ کنہٕ بوٕن

وُنہٕ کس تور چھُینہٕ واتان ظوٕن

ینہٕ مارٕ موٚت گوسرت سنگہٕ گوٕن

وُنہٕ کس تور چھُینہٕ واتان ظوٕن

(ترجمہ:۔ وہ نہ تو آکاش پر ہے اور نہ دھرتی پر۔ کس سے کہوں کہ تصور کی بھی وہاں تک رسائی نہیں۔ اس محبوب کا تو بس ذکر خیر کیا جا سکتا ہے نہیں تو وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی تخیل کے پر بھی ٹوٹ جاتے ہیں)۔

چہرے بشرے سے تو وہ بالکل ایک کسان۔ ایک دیہاتی لگتے تھے۔ معصومیت اور خلوص کا پیکر۔ ان کی کسی بھی ادا میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا مگر اس کے باوجود سب لوگوں کی نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ کوئی اسطوری کردار تصورات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آکر عوام کے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ مجھے اس وقت اپنا ننھیال یاد آگیا۔ وہاں جب بھی میر صاحب کا ذکر ہوتا تھا تو بڑے بوڑھے کہتے "میر صاحب بڑے ہی نیک سیرت اور خدا ترس شخص ہیں"۔ اس کے بعد بچوں کو صلاح دی جاتی تھی "دیکھو جب بھی میر صاحب کا سامنا ہوا سلام کرنا بھولنا نہیں، بزرگوں

کی دُعا میں اثر ہوتا ہے"۔ اس دن جب میں نے اس بزرگ کے ساتھ مشاعرے میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔

میر صاحب کے لئے غالباً یہ پہلا اور آخری عوامی مشاعرہ تھا جس میں شریک ہونا انہوں نے قبول کیا تھا۔ وہ بھی نہ جانے کتنے جتن کے بعد۔ اس کے علاوہ انہوں نے ریڈیو کے لئے بھی ایک انٹرویو ریکارڈ کروایا تھا جو غالباً وہاں کے آرکائیوز میں ابھی تک محفوظ ہے۔

میرے لئے اس بات کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ میر صاحب ایک بڑے صوفی تھے یا ایک بڑے شاعر۔ کیوں کہ ان کی شخصیت کے یہ دونوں پہلو آپس میں کچھ اس طرح گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ان کی زندگی ریاضت اور عبادت سے عبارت تھی اور ان کی شاعری داخلی تجربات کا ایک دلآویز اور دلکش مرقع۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی اور شاعر کی حیثیت سے زندگی میں ہی انہوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ اتنی شہرت جو بہت کم لوگوں کا مقدر ہوتی ہے۔ ان کی شاعری راہ حق کے راہ گیروں کو سکون اور راحت دیتی تھی اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر کتنے ہی لوگ شمع صداقت کو فروزاں کرکے بار بار حاضری دینے کے لئے آتے اور اپنی جھولی بھر لیتے تھے۔

ہمارے دور میں دو ہی شعرا کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ انہوں نے کبھی بڑائی اور عظمت کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹا اور دنیا کے شور و غل سے دور رہ کر اپنے اندر کے سنگیت سے محظوظ ہوتے رہے۔ وہ شہرت کے پیچھے نہیں دوڑے بلکہ شہرت نے خود آکر ان کے قدم چوم لئے۔ یہ دو شاعر ہیں صمد میر اور احد زرگر۔ وہ ایک دوسرے کے ہم عصر بھی تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے منہ پہ تو تعریفیں کرتے اور پیٹھ پیچھے چھرا گھونپنے کی سازشیں کرتے۔ دونوں نے وقتی نظام کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے در دولت پر جاکر حاضری دی یا گھٹنے ٹیکے

یہ شان قلندری کتنے لوگوں کا اثاثہ ہوتی ہے۔ مگر دونوں نے اس قلندرانہ شان کو زندگی کے آخری لمحوں تک بنائے رکھا اور ایک مثال قائم کی کہ بڑا فن کار بننے کے لئے ڈھنڈورہ پیٹنے اور پٹوانے کی نہیں بلکہ انفرادی صلاحیت کی ضرورت ہے۔

صوفی شعرا ایک باقاعدہ اخلاقی قاعدے کے پابند ہونے کے علاوہ توکل کے متمنی ہوتے ہیں اور دنیا داری سے بہت کم رغبت رکھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ رشیوں کے بعد صوفی ہی ہمارے مخلوط تمدن کے مشعل بردار اور علمبردار ہیں۔ دنیا کے متلاشی لوگوں نے مادری زبان کی اور آنکھ اٹھانا تک گوارا نہیں کیا مگر صوفی شعرا نے مادری زبان کو سر آنکھوں پہ جگہ دی اور اس کا دامن ہیروں اور جواہروں سے بھر دیا۔ صوفی شعراء کی خاص بات یہ رہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان رہے۔ انہوں نے لوگوں کی زبان میں بات کی یہی وجہ ہے کہ عوام نے اُن کو گلے لگایا۔ اپنے پیشرو صوفی شعراء کی طرح صمد میر نے بھی عوام کے ساتھ اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا اور نہ ہی اپنے آپ کو عوام سے الگ یا بلند ہونے کا دعویٰ کیا۔ عوام کے ساتھ رہنے نے ان کے مشاہدے کو جلا بخشی اور ساتھ ہی انہیں الفاظ کا ایک ایسا ذخیرہ ملا جو ہر لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے۔ چنانچہ زبانداانی اور ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے صمد میر اس قدر سرمایہ دار ہیں کہ چند ایک شعرا ہی ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

صمد میر کا جنم ۱۸۹۲ء میں ہوا تھا۔ اس وقت میر کے والد سزورہ (اُلم صاحب) میں قیام پذیر تھے اور عارضی طور پہ یہاں ہی رہائش کی تھی۔ کیونکہ اپنے آبائی گاؤں منبل ہار (بڈگام) میں ان کی موروثی جائیداد اتنی کم تھی کہ اس پر گذارہ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ انہوں نے آری کشی کا ہنر سیکھا مگر گاؤں میں اس کی بھی مانگ نہیں تھی بحالت مجبوری وہ گاؤں چھوڑ کر شہر آئے۔ یہاں سزورہ میں شادی کی اور محنت مزدوری کر کے گذر بسر کرنے لگے۔ صمد میر کے والد خالق میر کو گانے بجانے کا شوق تھا اور ساتھ ہی اشعار

موزوں کرنے کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ ان کی شاعری کا اکثر حصہ کھو گیا ہے البتہ یہ مشہور گیت اب تک زبان زد ہے ؎

اچھہ پوشو جگرہ گوشو، اچھہ پوشو لولو

(ترجمہ: ارے او لکاؤلی کے پھول، میرے جگر کے ٹکڑے، او جھومتے ہوئے لکاؤلی کے پھول)

محنت کش اور جفا شناس خالق میر سلوک کی راہ کے بھی راہی تھے۔ اس اعتبار سے میر کو دھن دولت نہ سہی، شاعری اور تلاش حق کی آرزو اپنے والد بزرگوار سے وراثت میں ملی تھی۔ ان کا کلام ان کے مریدوں کے زبان زد ہے مگر اسے کسی نے بھی قلمبند نہیں کیا اور یہ دولت اُن کے ساتھ ہی ہم سے چھن گئی۔ ان کی چند ایک چیزیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ خالق میر کو شعر کہنے کا اچھا سلیقہ تھا۔

خالق میر نے پہلی شادی نمبل ہار میں ہی کی تھی مگر عین جوانی میں بیوی انہیں داغ مفارقت دے گئی۔ بیوی کی بے وقت موت بھی شاید ان کے نمبل ہار کو چھوڑ کر جانے کی محرک ثابت ہوئی۔ پہلی بیوی سے ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بہن بھائی بھی نہیں تھے اس لئے انہوں نے گاؤں چھوڑ کر جانے میں ہی خیر سمجھی۔ نمبل ہار میں ان کی جو تھوڑی بہت جائیداد تھی وہ ان کے یک جدیوں نے ہڑپ کر لی۔ گھومتے گھامتے آخر کار انہوں نے نروره میں دوسری شادی کی اور کافی دیر تک یہاں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ مگر زندگی کے آخری ایام میں خالق میر بیوی بچوں کو چھوڑ کر نمبل ہار کے نزدیک "اگر" میں گوشہ نشین ہو گئے۔ انہوں نے "اگر" میں ہی وفات پائی اور وہیں آسودہ ہیں۔ دوسری بیوی کے کے بطن سے خالق میر کے تین بیٹے ہوئے — صمد میر، رحیم میر اور محمد میر۔ وہ اس قدر گذارہ مند بھی نہیں تھے کہ بچوں کو پڑھاتے لکھاتے۔ بچے جونہی سن بلوغ کو پہنچے انہوں نے باپ کی طرح محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنا شروع کیا۔ جب خالق میر نے گھر کو تیاگ کر گوشہ نشینی اختیار کی اس وقت بچوں اور خاص کر صمد میر کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔

سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد کافی دیر تک صمد میر نزورہ میں ہی ڈیرہ جمائے بیٹھے رہے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں ہی انہیں شادی کی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا تھا۔ ذمہ داری نے انہیں سالہا سال تک بنل ہار کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ محنت مزدوری کرکے پیٹ پالنا ان کا مقدر بن گیا تھا۔ کبھی وہ حمال کا کام کرتے اور کبھی ترکھانوں کے ساتھ جاتے۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں انہوں نے باپ کے نقش قدم پر چل کر آری کشی کرنا شروع کی۔ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے صمد میر کو اپنے والد کے تئیں ذمہ داریوں کا بھی بھرپور احساس تھا۔ پہلے تو وہ بنل ہار جانے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے مگر جب خالق میر نے وہاں گوشہ نشینی اختیار کی تو صمد میر کو ہر ہفتے والد کی خبر گیری کرنے کے لئے پاپیادہ بنل ہار جانے میں کوئی چارہ کار نہیں رہا۔

آری کشی کا کام انہیں پورے سال شہر میں کرنے کو نہیں ملتا تھا۔ اس لئے وہ آری اٹھائے مختلف علاقوں میں کام کرنے کے لئے جاتے اور جہاں بھی کام ملتا، وہاں جم کر کام کرتے اور اپنی راہ لیتے۔ چنانچہ ایک بار وہ گھومتے گھومتے ہندواڑہ جا پہنچے۔ اور کافی دن تک وہاں کام میں مصروف رہے۔ یہاں ان کی جان پہچان کچھ پنڈت بزرگوں کے ساتھ ہوئی۔ ان ہی بزرگوں کی صحبت میں انہوں نے پہلی بار شاستر (یعنی ہندو فلسفے) سے جانکاری حاصل کی۔ جانکاری کی اس دولت میں میر نے اسوقت کافی اضافہ کیا جب انکی شناسائی کرشورم کے پنڈت مادھورام سے ہوگئی۔ دونوں کے درمیان گہری دوستی تھی جو مرتے دم تک دونوں نے قائم رکھی۔ مادھورام میر سے پہلے ہی سدھارا مگر جب تک میر زندہ رہے وہ اس کے گھر اور بیوی بچوں کی خبر گیری اور ضرورت پڑنے پر مدد کرتے رہے۔ اب ایسے دوست ہی نہیں رہے، دوستی پینے تو پینے کہاں ـــ!

سلوک کے منازل طے کرنے کی چنگاری صمد میر کے اندر باپ کی زندگی میں ہی بھڑک

الٹی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ چیز ان کے خون میں پہلے ہی موجود تھی مگر ابھی اس چنگاری کو دھیرے دھیرے الاؤ ہونا تھا۔ یہ چنگاری اس وقت شعلہ بن گئی جب میر کو واگر کے حبیب نجار کی رہبری سے کسب فیض کرنے کا موقع ملا۔ "واگر" نمبل ہار کے ساتھ ہی ایک گاؤں ہے۔ اب نمبل ہار کے ساتھ صمد میر کو دو طرفہ تعلق پیدا ہو گیا۔ ایک والد کے ناطے اور دوسرا پیر و مرشد کے ناطے۔ چنانچہ یہی چیز انہیں واپس نمبل ہار کھینچ لائی۔ یہی وجہ ہے کہ صمد میر کی ابتدائی شاعری میں کہیں جگہ نرورہ کا ذکر آیا ہے ؎

صمد نرورہ ژٕ روزٕ با ہوش

(ترجمہ: اے نرورہ کے صمد میر ہوش میں رہ)

مگر بعد میں انہوں نے کہیں بھی نرورہ کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ نمبل ہار کا ذکر کسی کسی جگہ آیا ہے۔ اس بات کا ذکر اس لئے کرنا پڑا کہ ہو سکتا ہے کہ کل کو یار دوست صمد میر نرورہ اور صمد میر نمبل ہار کو دو مختلف شاعر ثابت کرنے کی کوشش کریں، بالکل اسی طرح جس طرح مقبول کرالہ واری اور مقبول امرتسری کا بکھیڑا کھڑا کیا گیا ہے۔ حالاں کہ تحریری شہادت کی بنیاد پر اس بکھیڑے کا نہ کہیں سر ہے اور نہ پیر۔ مگر تفنن طبع کے لئے کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ خیر۔ موت کا بلاوا آنے کی وجہ سے خالق نجار میر کی رہنمائی کافی دور تک نہیں کر سکا مگر اس نے میر سے کہہ کے رکھا تھا کہ میرے بعد بٹہ مالنہ (سرینگر) کے خالق نجار کا دامن تھام لینا، وہی تمہاری رہبری کرے گا۔

میر کے دونوں اولین مرشد قادر صاحب "کیہنہ" کے طالب تھے جو خود مشہور کشمیری شاعر رحمان ڈار کا مرید تھا۔ ان سبھی لوگوں کا تعلق کبروی سلسلے سے تھا اور شاعری کبروی سلسلے کی اس شاخ کی گھٹی میں پڑی تھی۔ میر کا اپنا بیٹا آسی،

جیسے مرحوم کہتے آنسو پھوٹ پڑتے ہیں، بھی اچھی شاعری کرتا تھا اور آج صمد میر کا پوتا (بڑے فرزند کا بیٹا) بھی اشعار موزوں کرتا ہے ۔ اس بات کا اظہار میر نے خود بھی کیا ہے کہ

پیر در پیر چھہ نس مس میر ما خام دؔاۓ

(ترجمہ: نسلاً بعد نسلاً وہ مجھے سرشار کرتا رہا میرکچی گولیاں کھیلنے والا ثابت نہیں ہوا)

میر اپنے مرشد کے ساتھ گپکار کے راج محل (اوبرائے پیلس ہوٹل) کی تعمیر کے دوران مزدوری کے لئے جاتے تھے ۔ یہاں وہ جو کچھ کماتے مرشد کے سامنے رکھ دیتے تھے ۔ اور وہ جو کچھ انہیں اخراجات کو پورا کرنے کے لئے اپنی مرضی سے دیتا، میر اسی پر گذارہ کرتے تھے ۔ مصروفیت کے ان ہی دنوں میں صمد میر نے پہلا گیت موزوں کیا ۔ جو میرے بچپن میں ہر طرف گونج رہا تھا ۔

وؔلیسہ کار مشکل بار گوؔب گوم
وہتراون پیوم
گاۓ لہ پانس کالہ رنگ گوم
وہتراون پیوم

(ترجمہ :- میری سکھی یہ مشکل کام مجھ پر گراں گزرا
اٹھانا ہی پڑا مجھے یہ بار
میری لالہ فام رنگت کالی ہوگئی
اٹھانا ہی پڑا مجھے یہ بار)

میر کے اس اولین نغمے میں داخلی موسیقی کی لے اس قدر زوردار ہے کہ سننے والے کا روم روم جھوم اٹھتا ہے ۔ یہی گیت میر کے مستقبل کی حسین بشارت ہے ۔ گیت کے اندر جو کھو جانے کے درد کا گہرا احساس ہے وہ متاثر

کئے بغیر نہیں رہتا۔ لگتا ہے کہ بقول میر تقی میر اس ناتواں نے جو بار گراں اپنے کندھوں پر اٹھا لیا ہے اسے اٹھانے میں سننے اور پڑھنے والے بھی شامل حال ہیں۔ فن کارانہ صداقت کا یہی رنگ عبدمیر کی شاعری کی منفرد جہت ہے۔

ان کی عمر پچیس چھبیس سال کے آس پاس تھی جب وہ شہر کو چھوڑ کر اپنے آبائی مسکن نمبل ہار واپس چلے آئے۔ یہاں بھی انہیں لوہے کے چنے چبانے پڑے۔ آبائی وراثت کو حاصل کرنے میں انہیں زبردست کٹھنائیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ گھر کو نئے سرے سے سنوارنا ضروری تھا اور اسے سنوارنے کے لئے روپے پیسے کی ضرورت تھی۔ مگر محنت مزدوری کر کے انہوں نے مشکلات پر قابو پا لیا اور ساکھ جمالی۔ ایک مرد میدان کی طرح انہوں نے ہر مصیبت کا جم کر مقابلہ کیا۔ کسی کی منت سماجت نہیں کی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور منتشر شیرازے کو یکجا کر کے ایک نئی دنیا آباد کرنے کی ٹھان لی اور بالآخر کامیابی حاصل کی مگر بکھراؤ کے اس عالم میں بھی وہ راہ حق سے غافل نہ رہے۔ انہوں نے دن کو دنیا سنوارنے اور رات کو سلوک کی راہ پر چلنے کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال بعد اُن کا شمار نمبل ہار کے کھاتے پیتے گھرانوں کے ساتھ ہونے لگا۔

میر کی زندگی کا سب سے خوبصورت پہلو یہی تھا کہ وہ ایک باعمل انسان تھے۔ انہوں نے دنیا داری کے لوازمات کو بھی نبھایا اور عاقبت پر بھی نظریں جمائے رکھیں۔ انہوں نے دنیا پر عقبیٰ کو قربان نہیں کیا اور نہ ہی عقبیٰ کے لئے دنیا داری سے منہ موڑ لیا۔ انتہا پسندی کی رو میں نہ بہہ کر انہوں نے میانہ روی کی ٹھان لی۔ حالانکہ جس حالت میں انہوں نے نمبل ہار میں مشکلات کا سامنا کیا اس حالت میں سورماؤں کے قدم بھی لڑکھڑا جاتے۔ ایسی حالت میں ان کے لئے گوشہ نشین ہونا آسان بھی تھا اور آرام دہ بھی۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہی وہ باتیں ہیں جو اُن کی شخصیت کو پرکشش بناتی ہیں۔

جس وقت وہ سلوک کی منزلیں طے کرتے کرتے بلندی سے ہمکنار ہوئے، شہرت کے ہالے میں ان کا چہرہ دمک اٹھا مگر وہ عمل کی زندگی سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔ وہ حسبِ دستور اپنے روزمرہ کے فرائض ادا کرتے رہے۔ ان کی سالکانہ زندگی اور دنیاداری کی زندگی میں ذرہ بھر بھی تضاد نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی زندگی میں ایک ایسا سلیقہ، ہم آہنگی اور توازن پیدا ہو گیا جو شاذ و نادر ہی اس قبیل کے لوگوں کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک وہ سرگرم عمل رہے۔ وہ گھر میں رہ کر سب لوگوں کے بعد سوتے اور سب سے پہلے اٹھ بیٹھتے تھے۔ آدھی رات کو بستر چھوڑنا ان کی عادت میں شامل تھا مگر بیداری کے عالم میں وہ کسی کی نیند میں خلل کا باعث نہیں بنتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں گھر چھوڑ کر جاتے وقت میر دروازہ اتنی آہستگی کے ساتھ کھولتے اور بند کرتے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ پو پھٹنے کے سمے جب وہ لوٹ کر آتے تو جان بوجھ کر کھانستے تاکہ گھر کے دوسرے لوگوں کو ان کی آمد کا پتہ چلے۔ اس کے بعد پھر ٹانگیں پسارتے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا گیا تھا کہ میر صبح کو کافی دیر تک سوئے رہتے ہیں۔ بنیادی طور پر انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اپنے لئے دوسروں کو تکلیف دینا مناسب نہیں۔ عبادت کا مقصد یہ نہیں کہ اس کی نمائش کی جائے۔ کسی کو چھیڑے بنا حق میں ڈوبے رہنا ان کی زندگی کا اصول تھا اور عمر بھر وہ اسی اصول پر کاربند رہے۔

کھانے پینے کے معاملے میں بھی میر کافی محتاط تھے۔ وہ کھاتے اس لئے تھے کہ سانس قائم رہے ورنہ ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو صرف کھانا پینا ہی زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں۔ صبح کو وہ کڑوی چائے (بغیر دودھ کے) کا ایک پیالی پیتے تھے اور کچھ دیر بعد کشمیری چائے کا نصف پیالہ۔ عموماً چائے کے ساتھ چٹکی بھر چاول کا ستو استعمال کرتے تھے۔ چائے کے ساتھ روٹی کھانا انہیں بھاتا نہیں تھا۔ دوپہر کو چاول کھاتے، مگر

اتنے تھوڑے سے کہ اس سے کسی کم سن بچے کا پیٹ بھی نہیں بھر پاتا۔ گوشت کھانا انہیں پسند نہیں تھا۔ دو بوٹی گوشت کھا کر ہاتھ کھینچ لیتے اور کہتے "بس بس کافی ہوا۔ اب مجھ سے اور کھایا نہیں جاتا"۔ ہاں ایک بات ہے کہ سبزیاں انہیں کافی پسند تھیں۔ حق تو یہ ہے کہ نفس کا غلام ہونے کے بدلے انہوں نے نفس کو غلام بنا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں زندگی بھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میر اکثر دعوتوں پر جانے سے کتراتے تھے۔ ایک رشی کی طرح انہوں نے روکھا سوکھا کھا کر گزر بسر کرنا اپنا روزمرہ بنا لیا تھا۔ وہ مجبوری کی حالت میں ہی دعوت پر جاتے مگر ایسے موقعوں پر لوگوں کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے نہیں دیتے تھے۔ اکیلے چلے جاتے اور چند نوالے کھا کر واپس چلے آتے۔ کسی دوسرے کے گھر جا کر رات کو اکثر واپس گھر چلے آنا ان کا معمول تھا۔ موسم سہانا ہوتا تو رات کھلے آسمان تلے گزارنے میں لطف محسوس کرتے۔ ہاں ایک اور بات تھی وہ یہ کہ وہ الگ سے کھاتے پیتے تھے اور اکثر اپنے کمرے کو کسی غیر کو سونے نہیں دیتے تھے۔ ہنگاموں کے ساتھ انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور فضول باتیں کرنے کے لئے ان کے پاس وقت تھا ہی کہاں۔ وہ ایک ایک لمحے کا مناسب استعمال کرنے کی دہائی دیتے تھے۔ ان کے ہاں ربط و ضبط کی پابندی ہر ایک کے لئے ضروری تھی۔ انکی مجلس میں بیٹھ کر سکون و راحت کا احساس ہوتا تھا۔ سینکڑوں لوگ بیٹھے ہوتے مگر کس کی مجال تھی کہ زور سے بولتا یا کھسر پھسر کرتا۔ آرام فرمانے کے دوران انہیں جگانا بڑا مشکل کام تھا۔ ایسے موقعوں پر لوگ اکثر صبر سے کام لیتے تھے۔ میر صاحب باتیں تول تول کر کرتے تھے۔ ان کی نپی تلی باتوں میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ معنی کی کئی جہتیں ہوتی تھیں۔ لگتا تھا کہ باتیں نہیں ہو رہی ہیں خوشبو کی دھارائیں پھوٹ پڑی ہیں۔ نخوت اور تکبر جیسی چیزوں کا میر کے ہاں شائبہ تک نہیں تھا۔ ان کی پوشاک یا چال میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کسی کو اس بات کا اندازہ ہو جاتا کہ یہ کوئی خاص آدمی ہے

یا اس شخص میں کوئی خاص بات ہے ۔ انہیں تو نظر باز ہی پہچان سکتے تھے ۔ عام انسان تو
انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا ۔ اُن کی آنکھوں کی گہرائی اور چمک، چہرے
کی رونق اور مسکراتی ہوئی پیشانی پر نظر ڈالتے ہی دیکھنے والوں کو ان کی عظمت کا اندازہ
ہوتا تھا اور وہ ان کی راہوں میں جان لٹانے کے لئے بے تاب ہو جاتے ۔

اپنے بچوں اور طالبانِ حق کو وہ یہی تلقین کرتے کہ بیکاری سے دور رہو اور ہمیشہ
کسی کام میں مشغول رہنا اپنا شیوہ بنالو ۔ بیکار آدمی خدا کو بھی پیارا نہیں ہوتا اور اچھے کام
کا پھل بھی اچھا ہی ہوتا ہے ۔

میر تکنیکی معنوں میں خواندہ نہیں تھے ۔ انہوں نے سکول کا منہ تک نہیں دیکھا تھا مگر
عملی زندگی سے انہوں نے اتنا کچھ حاصل کیا تھا کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اُن کے سامنے بات
کرنے سے ڈرتے تھے اور ان سے کچھ سیکھنے یا لینے کے متمنی رہتے تھے ۔

میر صاحب بڑے ہی خوش اخلاق بزرگ تھے ۔ کسی کی برائی کرنا انہیں بھاتا
نہیں تھا ۔ ہر ایک سے محبت کے ساتھ پیش آتے تھے ۔ میر صاحب گانا سننے کے کافی
شوقین تھے ۔ اکثر اپنے پیشرو صوفی شعرا خاص کر شمس فقیر کا کلام سننا پسند کرتے تھے ۔
اگر گانے میں من لگتا تو جھوم اٹھتے ۔ اور اگر گانا پسند نہ آتا تو محفل سے اٹھ کر چلے
جاتے ۔ شمس فقیر کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ تو پہنچا ہوا بزرگ ہے مجھے تو ابھی منزلوں
کو سر کرنا ہے ۔ میر کا قد اوسط درجے کا تھا ۔ مونچھیں گچھے جیسی تھیں ۔ اپنا سر اکثر استرے
سے منڈواتے تھے ۔

میر صاحب نے ۹ جنوری ۱۹۵۹ء کو صبح کے چار بجے اپنی جان جانِ آفریں کے
سپرد کی ۔ ذہنی طور پر وہ پہلے ہی سے دنیا کو چھوڑنے کے لئے تیار بیٹھے تھے خود ہی
کہہ گئے رکھا تھا ؎

سنہ ژوہس ہشر پیوس کُنہ زوٗنیے

زہنہٕ گیہٕ اوسُم لون

وۄہ ژٕ صمدمیرن ہنیوت سکھرُن ییے

ننہٕ مالیٚن ییے میٚون

(ترجمہ: چودھویں صدی ہجری میں، میں ایک اکیلا ہوں۔ پیدا ہوتے وقت ہی یہ میری تقدیر میں لکھا تھا۔ اب صمدمیر نے تیاری شروع کر دی، کیوں کہ وہاں ہی میرا میکہ ہے)

وصیت کے مطابق ان کو "اگر" کے مقام پر والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

اب قبر پر ایک حجرہ بھی تعمیر ہو چکا ہے۔ میر صاحب کے مزار پر ہر سال میلہ لگتا ہے جس میں آس پاس کے لوگ اور ان کے طالب شریک ہوتے ہیں۔ یہاں پر وہ سبھی لوگ جمع ہوتے ہیں جنہیں انہوں نے آواز دی ہے ؎

آلو ہیاٚئی بوز خوش قسمتو

ہتو وُلی وُنی بوز بتہٕ تُز انہہ

(ترجمہ: اے نیک بخت میرے بلاوے پر کان دھر۔ کیونکہ بار بار بلانے پر بھی تو نے ان سُنی کر دی)۔

میر کے دو بیٹے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا لڑکا غلام رسول میر اور لڑکی زندہ ہے۔ البتہ چھوٹا لڑکا آسی ابن صمد میر چند سال پہلے جوانی میں رحلت کر گیا۔ میر کی شاعری انکی زندگی میں "کلام صمد میر" اور "آرہ ول" کے نام سے مختلف کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ انکی ایک منظوم داستان "اکہ نندن" بھی اسی زمانے میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ ریاستی کلچرل اکادمی نے ان کا مکمل کلیات "کلیات صمد میر" کے نام سے شائع کیا ہے جس کا دوسرا ایڈیشن بھی بازار میں آچکا ہے۔ "ہندوستانی ادب کے معمار" سلسلے کے تحت ساہتیہ اکادمی عنقریب صمد میر کے بارے میں ایک مونوگراف شائع کر رہی ہے۔

میر نے شریعت سے حقیقت کا سفر عمل کے بل بوتے پر کیا۔ زندگی سے کنارہ

کشش ہو کر نہیں بلکہ بھرپور زندگی گذار کر ــــ اس سفر میں ان پر کیا کچھ بیتی اس کا اظہار انہوں نے ایک جگہ یوں کیا ہے :-

شریعت پیوم پالن ہر رنگ پان گالن
اتین گوم ترکِ سنت اگر بوزکھ یہ چھئے کمتھ

(ترجمہ : مجھے شریعت پر عمل پیرا ہو کر اپنے آپ کو گھلانا اور پگھلانا پڑا۔ تب ہی میں قاعدوں سے چھٹکارا پا سکا۔ ہمت ہے تو میرے راستے پر چل)۔

ارجن دیو مجبور

اس مضمون کا آغاز کرتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے کشیپ بندھو
کی وہ بیٹھک بار بار گھوم جاتی ہے جس میں ۱۹۶۴ء کے بعد کئی بار اُن سے
ملا ہوں۔ ایک تخت پوش پر بیٹھی ایک پُرکشش شخصیت جس کے سامنے
والی میز پر رکھی کتابیں، قرینے سے رکھے کئی قلم اور لُغت مجھے بار بار بندھو جی
کی لمبی صحافتی اور سیاسی زندگی کے ورق کھول کھول کر دکھاتے رہتے۔
گیرُو (نور پورہ) کے اُن کے اپنے بنائے مکان کی پہلی ہی منزل میں وہ اپنی
زندگی کا آخری لمبا دور پورا کر رہے تھے۔

وہ باتوں باتوں میں میرے ساتھ اتنے کھُل گئے کہ میں ان کی زندگی
کے واقعات کو سُنتے سُنتے محو ہو جاتا۔ میں سوال پر سوال کرتا رہتا اور وہ لگاتار

گھنٹوں تک بولتے رہتے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کچھ بنیادی باتوں پر میں اُن سے اختلاف کر بیٹھتا اور وہ جذبات میں آکر کچھ گرم ہو جاتے لیکن اس کے باوجود وہ ہر بار بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔

کشیپ بندھو کو میں نے پہلی بار ۱۹۴۲ء میں دیکھا تھا وہ اپنے آبائی گاؤں آئے تھے مرینگر سے۔ وہ کھدّر کی دھوتی اور کھدر کا ہی ایک موٹا کُرتہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کا چشمہ بھی موٹی فریم والا تھا اور پیروں میں تھی کالی گرگابی۔ ان دنوں میں چھوٹا تھا اس لئے کوئی خاص بات نہ ہو سکی۔ جب میں نے ۱۹۴۴ء میں اُنہیں لاہور سے ایک خط لکھا اور ہفتہ وار "دیش" بھجوانے کے لئے کہا تو وہ کئی سال تک میرے نام یہ اخبار روانہ کرواتے رہے۔ اور میں چٹخارے لے کر اس اخبار کو پڑھتا رہا اور وطن کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں سے واقف ہوتا رہا۔

میں لاہور میں وہ آشرم بھی دیکھنے گیا جہاں بندھو جی سنسکرت پڑھتے تھے۔ یہ آشرم ان دنوں راوی پُل کے پار تھا اور اس کا نام وِرجانند آشرم تھا اس کے صحن میں لمبے لمبے کھجور اور یوکلپٹس کے درخت سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اسی آشرم کو پروفیسر عبدالقادر سروری نے برہمو ودیالیہ کہا ہے جو میرے مشاہدے کے مُطابق ٹھیک نہیں۔

کشیپ بندھو کا اصلی نام تاراچند تھا۔ وہ گیرُو (نُورپورہ) میں ٹھاکور بٹ کے گھر میں ۲۴ مارچ ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ٹھاکور بٹ کو کافی عرصے تک لوگ ٹھاکور غریب کہتے تھے اور یہ نام ان کے حسبِ حال

بھی تھا۔ یہ زمانہ تھا مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد حکومت کے آخری برسوں کا۔ اپنے ہی گھر میں وہ متبنیٰ بھی تھے اور اس لئے وہ بٹ کی بجائے کول کہلائے۔ اور اُن کے واحد فرزند بھی وِبھو کول کے نام سے ہی جانے جاتے ہیں۔ ان کی بیوی بملاجی بقید حیات ہیں اور جموں میں رہتی ہیں۔

اپنے طالب علمی کے زمانے سے متعلق رونگٹے کھڑی کرنے والی لمبی داستان بندھو جی نے مجھے خود سنائی ہے۔ وہ پانچویں تک مقامی سکول میں پڑھتے رہے اور اس کے بعد حصول تعلیم کے لئے سرینگر چلے آئے۔ یہاں وہ گورنمنٹ سکول (باغ دِلاور خان) میں چھٹی جماعت میں داخل ہوئے اور یہیں پر انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں ریاست میں تعلیم حاصل کرنا کارے دارد والا معاملہ تھا۔ خاص کر دیہاتی طلبا کو ایک بڑی دقّت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ تھا سرینگر میں دوران تعلیم رہائش، کا مسئلہ۔ اس مسئلے کی وجہ سے تاراچند کو کیا کیا نہ کرنا پڑا۔ وہ رشتہ داروں کے پاس گئے لیکن کسی نے اُن کی مدد نہ کی۔ آخر خبانہ محلہ کے ایک ماسٹر صاحب کو اُن پر رحم آیا اور انہوں نے کئی سال تک اس علم کے پیاسے جیالے طالب علم کو اپنے گھر میں جگہ دی۔ ماسٹر صاحب بھی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور کئی دفعہ تاراچند کو چاول کے کن کا مانڈا کھا کر گذارہ کرنا پڑتا تھا۔ جب کبھی انہیں فیس کے لئے دو چار پیسے کی ضرورت پڑتی تو وہ خبانہ محلہ کے ہی ایک دوکاندار پرسادرام سے اپنی بپتا کہتے اور یہ نیک سیرت دوکاندار تاراچند کی مالی معاونت کرتا۔ دوران تعلیم تاراچند نے کیا کیا برداشت کیا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اپنے رشتے دار اور اُن کے ہمسائے اُس سے کئی

طرح کی بیگار لیتے ــــ" تاراچند ذرا شالی کا بورا مشین پر لے کر کُٹوا لانا۔ تاراچند
ذرا بازار سے سبزی تو لانا۔ او تارؔا ذرا چلم میں تمباکو تو بھر بیٹھے بیٹھے کیا کر
رہا ہے"۔ یہی طعنے اور اسی طرح کی سختیاں سہتے سہتے آخر تاراچند انٹرنس پاس
ہو گیا۔ آخری سال یعنی دسویں کا ایک واقعہ انہوں نے مجھے سُنایا تھا جس سے
اس طالب علم میں رہنمایانہ کردار کی ابتداء ہوتی ہے۔

ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول سرینگر میں پنجابی طلبا بھی زیر تعلیم
تھے۔ وہ کلاس میں سب سے آگے والی بینچوں پر بیٹھتے اور اُن کی جگہیں اُن
کے آنے تک خالی رہتی تھیں۔ اگرچہ کشمیری طلبا اُن سے قبل ہی کلاس میں
پہنچ جاتے تھے لیکن اُنہیں سب سے آگے بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ اس سے
تاراچند کے احساس کو پہلی ٹھیس لگی اور اُس نے سبھی کشمیری طلباء کو اکٹھا
کیا اور اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی۔ معاملہ ہیڈ ماسٹر اور ناظم
تعلیمات سے ہو کر مہاراجہ تک جا پہنچا۔ اور ایک بار تاراچند نے اپنے آپ کو
مہاراجہ کی فٹن کے سامنے لٹا دیا۔ مہاراجہ نے اُسے ملنے کے لئے وقت اور بالآخر
مخصوص جگہوں کی تفریق ختم کی گئی۔ یہ تاراچند کی زندگی میں پہلی (سیاسی)
کامیابی تھی۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی نوعیت کی ہی جدوجہد تھی لیکن اس کو
پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر تاراچند نے چین کا سانس نہیں لیا۔ ۱۹۱۹ء میں
انٹرنس پاس کرنے کے بعد، جیسا ان دنوں دستور تھا کشمیری پنڈتوں کا، تاراچند
نے ذریعہ معاش کے لئے چھوٹی سی نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اس زمانے
میں نوکریاں ملنا آسان کام نہ تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے عنانِ حکومت

سنبھال لی تھی اور ریاستی حکومت کے بیشتر عہدوں پر بیرون ریاست کے باشندے تعینات تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے کشمیری پنڈتوں اور ریاستی مسلمانوں کی زوردار جدوجہد کے نتیجے میں اور کسی حد تک اپنے لئے ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی غرض سے نوکریاں حاصل کرنے کے لئے "سٹیٹ سبجکٹ" یعنی ریاستی باشندہ ہونے کی شرط رکھی تھی اور اس سلسلے میں باضابطہ قانون بھی پاس کرایا تھا۔ اس قانون سے پہلے کشمیری پنڈتوں کیلئے اور بعد میں مسلمانوں کیلئے نوکریاں حاصل کرنا ممکن ہوسکا لیکن ریاستی ذرائع چونکہ محدود تھے اور ملک میں انگریزوں کا طوطی بول رہا تھا اسلئے نوکریاں حاصل کرنے کے مواقع پھر بھی کم ہی تھے۔

بہرحال اسی دوران تاراچند اب بلبل ہوگئے تھے اور شعر کہنے لگے تھے۔ ان کے اندر دبے اور زخمی انسانی احساسات نے جب کروٹ لی تو شاعری کے سوتے پھوٹ پڑے۔ شاعری کا یہ سلسلہ آگے چل کر اگرچہ اُنکی سماجی اور سیاسی زندگی کی لمبی جدوجہد نے دھیما کردیا لیکن شعر کی پرکھ، اچھے اور شگفتہ اشعار کا جمع کرنا اور بروقت موزون شعر گفتگو اور خطوط میں کہنا اُن کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اُن کی میز پر میں نے کئی ڈایریوں میں بے شمار خوبصورت اور خاص خاص اشعار لکھے ہوئے دیکھے ہیں۔

بلبلؔ نے ایک درخواست لکھی اُس وقت کے مہتمم بندوبست کے نام۔ وہ گلمرگ میں یہ درخواست لیکر اُن سے ملے اور درخواست کے آخر میں جو شعر انہوں نے تحریر کئے تھے ان کو پڑھکر مہتمم صاحب متاثر ہوئے اور تاراچند بلبل شجرہ کش کے عہدے پر فایز ہوگئے۔ اس دوران وہ علاقہ ناروا (تحصیل کولگام) اور ویری ناگ کے قریبی دیہات میں بندوبست کا کام سیکھتے رہے۔ یہاں اُنہیں اُن دنوں کشمیر میں پھیلی غریبی اور تنگ دستی

کو بغور دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بارے میں انہوں نے کئی کہانیاں مجھے سنائی ہیں۔ ایک واقعہ بیرون ریاست کے ایک تحصیلدار سے متعلق تھا۔ جب یہ تحصیلدار کسی علاقے میں شام کو گذرتا تو اُس علاقے کے دیہاتیوں کو گھاس کے گھٹھڑ جلا کر راستے میں روشنی کرنے کی ہدایت تھی۔ شاید تحصیلدار مذکورہ کا نام نتھوُ رام تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی تحصیلدار کے پاس وہ کئی بار تنخواہ لینے گئے لیکن انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس بات کا اظہار وہ خود یوں کرتے ہیں ؎

در دولت پہ گئے ہم نتھوُ کے بار بار
پاؤں میں پڑے چھالے، جوُتے پھٹے دو چار

خیر تاراچند بلبل کو نوکری راست نہ آنی تھی نہ آئی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لاہور چلے گئے۔ ان دنوں آریہ سماج، برہمو سماج، احرار اور دیگر مذہبی اور سُدھار وادی تحریکوں کا زور تھا۔ تاراچند بھی آریہ سماج کے اثر میں آ گئے اور لاہور کے ورجانند آشرم میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے داخلے کے روز سے ہی گوشت کھانا چھوڑ دیا اور عمر بھر کبھی گوشت کو چھُوا تک نہیں۔ وشوبندھو ورجانند آشرم کے پرنسپل تھے۔ تاراچند میں جو خدمت خلق کا جذبہ موجزن تھا اُسے دیکھ کر وشوبندھو اُن سے بہت خوش تھے اور وشوبندھو کے ہاتھوں ہی تاراچند بلبل کشیپ بندھو کہلوائے۔ اور اسی نام سے اُن کے گورو نے اُنہیں کشمیر کی خدمت کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ چند سال کے بعد آریہ گزٹ لاہور کے ایڈیٹر ہوگئے۔ اُردو سے اُنہیں لگاؤ تھا۔ شاعری اُنہیں عزیز تھی اور اب صحافت نے اُنہیں اپنی اور کھینچا اور لاہور کے اُس ماحول نے

جوان دنوں تحریکِ آزادیٔ ہند سے کافی پُر کشش، خطرناک اور خوشگوار تھا، اُن میں کشمیر کی آزادی کی تڑپ کو تیز تر کر دیا۔ آزادی کا یہ بیج آگے چل کر ایک تناور درخت بنا۔ لاہور میں قیام کے دوران وہ کوئٹہ گئے۔ یہاں کئی انقلابیوں سے اُن کا رابطہ قایم ہوا اور وہ نوکری چھوڑ کر آزادی کی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ کوئٹہ میں ایک روز چند دوستوں کے اصرار پر لورا ندی کو جو بلوچستان کی ایک چھوٹی سی ندی ہے دیکھنے گئے۔ اسے دیکھ کر انہیں کشمیر کی وتستا یاد آ گئی۔ وتستا یا جہلم سبھی ذی حس لوگوں کو وطن سے دُور رہنے پر یاد آتی ہے۔ دیا رام کا چرو، جو فارسی کے شاعر تھے نے ملک بدر کئے جانے پر کہا تھا:

مرا حُبِ وطن آشفتہ تر کرد
نمے دانم چرا قسمت بدر کرد
ز جوشِ گریہ چشمم اچھ بل شُد
بہت شُد، مار شُد، تالاب ڈل شُد

اور کشیپ بندھو نے لورا کے ہاتھ جہلم کو یہ پیغام دیا:

اے آبِ رودِ لورا، اتنی ہو مہربانی
جب سندھ بہہ کے آئے جہلم سے تجھ میں پانی
میری طرف سے اسکو چھاتی سے تو لگانا
رو رو کے اُس کو میری پھر داستاں سُنانا
کہنا اُسے خدا را، اے آبِ رودِ جہلم

شیدا ہے دُور تیرا، غربت میں تجھ سے چھٹ کر

گودی میں جسکو تُونے پالا تھا مثلِ مادر

وہ دُکھ اُٹھا رہا ہے، غربت میں تجھ سے چھٹ کر

بُلبُل نہ یہ وصیت احباب بھول جائیں

گنگا کے بدلے میرے، جہلم میں پھول جائیں

اس چھ بند والی نظم میں کشیپ بندھو کے دل میں کشمیر کیلئے جو عقیدت اور والہانہ محبت ہے اُس کا واضح اظہار ملتا ہے۔ وہ گنگا کے بدلے جہلم میں اپنے پھول ڈلوانے کی وصیت نوجوانی کے عالم میں کرتے ہیں۔ اور اپنی داستانِ غم رو رو کر مادرِ جہلم کو سُناتے ہیں۔

کوئٹہ سے واپس آکر لاہور میں اُس کی سیاسی سرگرمیاں تیز ہو جاتی ہیں۔ وہ کشمیری مزدوروں کی حالتِ زار سے چیخ اُٹھتے ہیں۔ اس بارے میں محمد دین فوق اُن کی رہنمائی کرتے ہیں۔ فوق صاحب اُن دنوں "فولادی پنجہ" نامی اخبار نکال رہے تھے۔ اسی زمانے میں کشیپ بندھو نے کشیری مزدوروں کو منظم کرنا شروع کیا اور اُس کے بعد کشمیری مزدور بورڈ کا قیام عمل میں لایا۔ کشیپ بندھو اس کے سیکریٹری بنے اور وہ ڈاکٹر اقبال سے بھی صلاح لیتے رہے اس بورڈ کے بارے میں لاہور اور ہند کے دوسرے اخباروں میں خبریں چھپنے لگیں۔ اسی بورڈ کا ایک شاندار اجلاس لدھیانہ میں منعقد ہوا جس میں موتی لال نہرو نے کشیریوں کے حق میں ایک زوردار تقریر کی۔ اور اسی بورڈ کے پلیٹ فارم سے "کشمیر کشمیریوں کے لئے" کا نعرہ پہلی بار بلند ہوا۔ لاہور کے

قیام کے دوران وہ بھگت سنگھ کی انقلابی پارٹی میں شامل ہو گئے اور سانڈرس کیس کی پاداش میں انہیں جیل ہو گئی۔

لاہور نے کشیپ بندھو کو رہنمائی کی تربیت دی اور صحافت کے زیور سے آراستہ کیا۔ وہ لاہور میں "اخبارِ عام"۔" اخبارِ کشمیری" اور "بہارِ کشمیر" کے حلقۂ ادارت میں شامل رہے۔

اُنیسویں صدی کی تیسری دہائی میں کشمیر میں ایک طرف مسلم کانفرنس کی بنیاد پڑی اور دوسری اور یہاں کے کشمیری پنڈتوں نے نوکریوں اور سماجی بدعتوں کے خلاف لڑنے کا آغاز کیا۔ کشیپ بندھو کشمیر کے حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ پریم ناتھ بزاز، شِونرائن فوطیدار، جیالعل کلم، دامودر بٹ (ہانجورہ) وغیرہ نے ان مسائل کو سمجھا اور کشیپ بندھو کو لاہور سے سرینگر بُلوالیا۔ یہاں آنے سے قبل اُن کی شادی ایڈوکیٹ وشنودت کی بیٹی بملا سے لاہور میں ہی آریہ سماجی ڈھنگ سے بالکل سادہ طریقے پر کردی گئی تھی۔ کشیپ بندھو کے سرینگر آنے سے یووک سبھا کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس سبھا کی سرگرمیوں میں کشمیری پنڈت نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا شروع کیا۔ شیتل ناتھ سرینگر اس سبھا کا مرکز بنا۔ یہ جگہ پہلے جوگی باغ کہلاتی تھی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں سادھو سنیاسی آکر ٹھہرتے تھے۔ چنانچہ یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ان دنوں امرناتھ یاترا پر روانہ ہونے والی" چھڑی مبارک" بھی اسی جگہ سے روانہ ہوتی تھی۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں کشیپ بندھو کشمیر کے سیاسی اور سماجی آسمان

پر چمکنے لگے تھے۔ یکم فروری ۱۹۳۱ء کو "مارتنڈ" نامی اخبار جاری ہوا۔ یہ یووک سبھا کا آفیشل آرگن تھا اور اس کے پہلے ایڈیٹر کشیپ بندھو۔ اور یہ روزنامہ ان کی ادارت کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں شمالی ہندوستان میں مقبول ہوگیا۔ چنانچہ اس روزنامے کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری "کشمیر میں اُردو" کے دوسرے حصے میں رقمطراز ہیں:

"مارتنڈ" وادی کے قدیم اخباروں میں سے ہے اور یہ مسلسل سنہ ۱۹۳۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۶۹ء تک شایع ہوتا رہا۔

جیسا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، پنڈت کشیپ بندھو نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ کسی فرد کا اخبار نہیں تھا۔ بلکہ "سناتن دھرم یووک سبھا کشمیر" کا ترجمان تھا۔ اور اس زمانے کے سارے اہلِ قلم اور خاص طور پر ادبی ذوق رکھنے والے کشمیری پنڈتوں کا مرکزِ نظر اور ان کی قلمی مساعی کا محور رہا۔ اس میں خبروں کے علاوہ پنڈتوں کے مذہبی اور سماجی مفاد، مذہبی تہواروں، مشاہیر، ادبی مشاغل، غرض ہر طرح کے مضامین شایع ہوتے رہے۔ مزاح نگاری کے ذوق کو بھی اس کے پہلے ایڈیٹر کشیپ بندھو، پردیسی اور کچھ اور لکھنے والوں نے فروغ دیا۔ اس کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن خاص طور پر دلچسپ ہوا کرتے تھے۔"

بندھو جی نے مجھے ایک روز بتایا کہ "مارتنڈ" نام اُنہیں پنڈت گواشہ لال کول نے سجھایا تھا۔ پروفیسر ٹی، این، ہوزہ جموں، کے مضمون "کشیپ بندھو۔ مارتنڈ کا پہلا ایڈیٹر" جو وتستا کلکتہ کے سالانہ نمبر میں چھپا

ہے جو کشیپ بندھو کی یاد میں شایع کیا گیا تھا، کے مطابق جو ادیب مارتنڈ میں بندھو جی کی ادارت کے دوران لکھتے رہے۔ ان میں پریم ناتھ پردیسی، ماسٹر زندہ کول، دینا ناتھ نادم، برجموہن دتاتریہ کیفی، حضرت مہجور کشمیری، ارجن دیو مجبور، جے۔ این۔ جگیاسو، دینا ناتھ دیگر، شام لال ولی، تیرتھ کاشمیری، پروفیسر نند لال کول طالب، گنگا دھر دیہاتی اور دینا ناتھ مست کشمیری شامل ہیں۔

کلکتہ سے انگریزی زبان میں شایع ہونے والے رسالے وِتستا میں کشیپ بندھو کا آخری انگریزی خط شایع ہوا ہے یہ خط انہوں نے ۱۸ دسمبر ۱۹۸۵ء کو تحریر کیا تھا اور اسی روز شام کو وہ اس دارِ فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اس خط میں وہ کلکتہ میں رہنے والے کشمیری پنڈتوں سے مخاطب ہیں اور اس خط میں اپنی اُس آخری تقریر کا تذکرہ کرتے ہیں جو انہوں نے رنبیر بھون، سرینگر کے ہال میں کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے کشمیری پنڈتوں سے کہا تھا کہ وہ مرکز کی طرف دیکھنے کی بجائے کشمیر کے لیڈروں سے ہی اپنے مسائل حل کرائیں۔ وہ اس خط میں دو باتوں کا تذکرہ اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہال کافی ٹھنڈا تھا اور ۸۷ برس کے ایک بوڑھے آدمی (اپنی طرف اشارہ ہے) کے لئے ہال میں گرمی کا کوئی بندوبست نہیں۔ یہاں تک کہ ہاتھ گرم کرنے کے لئے ایک عدد "کانگڑی" بھی موجود نہیں دوسرے وہ اُس کالے دور کا ذکر بھی کرتے ہیں جس میں تک بھگ ہر کشمیری پنڈت اپنے آپ کو مہاراجہ ہری سنگھ کا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا اور حالت

یہ تھی کہ انتظامیہ مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی اور فرقہ پرستی کشمیر کی گلیوں میں بے قابو ہو رہی تھی۔ اسی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے کشیپ بندھو کو یوگ سمجھا کی تنگ دامانی کو خیرباد کرنا پڑا تھا۔

لیکن اس سے قبل کہ ہم بندھو جی کی زندگی کے اہم پہلو یعنی سیاسی جدوجہد اور جیل یاتراؤں کی بات کریں، اُن کا بحیثیت ایک ریفارمر کے تذکرہ کرنا لازمی ہے۔

اس زمانے میں وِدھوا وِواہ (بیواؤں کی شادی) پر سماجی روک تھی۔ کشمیری پنڈت عورتیں نئے خیالات سے نابلد تھیں۔ بیاہ (شادی) اور دیگر رسومات پر فضول خرچی ہوتی تھی۔ محنت کے کاموں کو انجام دینا عار سمجھا جاتا تھا۔ نچلے طبقے کے لوگوں کو شادی کے لئے دربدر بھٹکنا پڑتا تھا۔ ان اور ایسے ہی بُرے رواجوں کے خلاف کشیپ بندھو نے سوشل ریفارم کی زبردست تحریک شروع کی۔ اس میں انہوں نے مارتنڈ اور آگے چل کر "کیسری" اور "دیش" کا سہارا لیکر کھُلے طور پر سماجی بدعتوں کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا۔ چنانچہ اس زمانے کے سوشل ریفارم کے حق میں لکھے گئے آج تک کشمیری وَنہ وُن رگانے والی پنڈتانیوں کو یاد ہیں۔ چند اشعار اور اُن کا ترجمہ درج ذیل ہے:

(کشمیری) تراوِ زوج پوٗژ نیبر دوڈ نئنہ بے
چھُے مُبارک دو تہ تھہارینہ بے
ژھلنی سوٗکھ بوکھ پکی بئنہ بئنہ بے
چھُے مُبارک دو تہ تھہارینہ بے

(پرانے ڈھنگ کا سر کا پہروا چھوڑ دے اور

ننگے سر چل ۔ اے دھوتی پہنے دُلہن ! تجھے مُبارک !

تو سوٹ اور بوٹ پہن اور زندگی کی دوڑ میں آگے چل

اے دھوتی والی دُلہن تجھے مُبارک !)

(کشمیری) دَے دی نئے جان گو پان شوٗمراو

میوہ گُلہٕ کی پاٹھِن پان نوٗمراو

دونۍ کرتہ ساد منگنادِ لولو

ژراو ترکہ وار ، ترکہ وار ژرادِ لولو

(خدا تمہیں شرم و حیا عطا کرے

تو ایک میوہ دار درخت کی طرح اپنا سر نیچا کر

ایک سادہ دھوتی اور کرتہ منگا لے

چھوڑ دے یہ زربفت کے آستین لگانا چھوڑ دے) ۔

(کشمیری) آو ریفارم ٹوڑہن نۍ بھالن

وادِ اوس یی سترائژ سالن

سادِ پیالن چاے چھے چینیہ یے

کھسہ ونگیس دونۍ مہاریٖنی ییے

(اب بھالیوں اور عورتوں کے مخصوص کھانے کے برتنوں

پر ریفارم کی پابندی عاید ہو گئی ۔ اب شادی کے بعد شام

کی خصوصی دعوتیں نہ ہونگی ۔ اب تو سادہ پیالیوں میں چائے

پہنتا ہے۔ اے ساڑھی والی دُلہن رنگولی پہ چڑھ جا)

اس نظم میں آگے چل کر زربفت کا کاروبار کرنے والوں کے کام میں
کمی آنے کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ جیسے کہ ہر سماج میں قدامت پرستی کے پرستار
بھی موجود ہوتے ہیں اُسی طرح سے سرینگر کے کچھ کشمیری پنڈتوں نے کشیپ
بندھو کی اس بے لوث تحریک کے خلاف مورچہ سنبھالا۔ اور کئی گانے ایجاد
ہوئے جو سماج سدھار کی تحریک کے خلاف شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے
جانے لگے۔ لیکن اس کے باوجود کئی برس تک اس سدھار کا اثر رہا۔ بیواؤں
کی شادیاں عام ہوئیں اور کشمیری پنڈت لڑکیاں گھروں سے نکل کر سکولوں
اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے آگئیں۔ لیکن چند برس گذر جانے کے بعد
سادہ دھوتیوں کی جگہ بنارسی اور دیگر قیمتی ساڑھیوں نے لے لی اور کشمیری
پنڈتوں نے بیاہ کے دن دروازے کے اوپر "سوشل ریفارم زندہ باد" لکھ تو
لیا لیکن فضول خرچیوں میں اتنا اضافہ کیا کہ کچھ نہ پُوچھئے۔ کشیپ بندھو
کی اس ترقی پسند تحریک کا جنازہ سرینگر کے کشمیری پنڈتوں نے چوراہے پر
نکال کے رکھ دیا اور بیاہ وغیرہ پر اندھا دُھند رسموں کی بھرمار برابر جاری
رہی۔ کشمیری پنڈتانیوں نے اس نیک کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور یہ وبا
گاؤں میں رہنے والے کشمیری پنڈتوں کو بھی نہ بچا سکی۔ بہرحال سماجی
بدعتیں مسلمان بھائیوں میں بھی بڑھ رہی ہیں اور نہ جانے کشمیریوں کو کب
ہوش آئے گا کہ وہ جہیز جیسی لعنت سے چھٹکارا پا لیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کشیپ بندھو اور نیشنل کانفرنس کی بات کریں

صحافتی میدان کے بارے میں اُن سے متعلق چند اہم باتوں کا ذکر ہو جائے جو مناسب بھی ہے اور اہم بھی۔ اُن کی ادارت میں روزنامہ مارتنڈ کا مختصر ذکر ہو چکا ہے۔ اس اخبار سے قبل جموں سے شایع ہونے والے "رنبیر" (اجرا ۱۹۲۴ء) میں بھی ملک راج صراف کے مطابق بعد ھوجی قلم کی جولانیاں دکھا چکے تھے۔ مارتنڈ کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشنوں کا ذکر اہم دکھائی دیتا ہے۔ عبدالاحد آزاد کی کتاب "کشمیری زبان اور شاعری" کے مطابق پروفیسر دیوندر ستیارتھی نے مہجور کے متعلق اپنے اہم خیالات کا اظہار ایسی ہی ایک اشاعت میں (مارتنڈ ۲۰ ماگھ ۱۹۹۱ بکرمی) کیا تھا جس میں انہوں نے مہجور کی نظم "پوشے متہ جانانو" (پھولوں کے ماتے میرے دلبر!) کو ایک شاہکار نظم گردانا تھا۔ مہجور کی فارسی نظم "گل ویرانہ" مارتنڈ ۲۷ ماگھ ۱۹۹۱ بکرمی (بمطابق ۱۹۳۳ء) میں چھپی تھی۔ اسی لئے سروری صاحب کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی نے جو مضمون شخصیات نمبر ۱۹۸۴-۸۵ء میں لکھا ہے اُس کے مطابق سروری صاحب کئی ماہ تک شیتل ناتھ جا کر مارتنڈ کے فائلوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ تاریخ ادبیات کشمیر (جو سروری صاحب بعد میں لکھ کر پورا نہ کر سکے) کے بارے میں سروری صاحب کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ استفادہ انہوں نے مارتنڈ سے کیا۔ وہ کہتے ہیں:

"مارتنڈ کا کنٹری بیوشن یہاں کے سب اخباروں پر بھاری ہے ہیں اور ایمہ صاحب آجکل شیتل ناتھ کی یاترا کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر پریمی کے مطابق سروری صاحب کشیپ بندھو سے بھی اسی کام کے سلسلے میں ملے تھے۔

مارتنڈ میں ایڈیٹوریل کے علاوہ بندھوجی چلنت اور پاگل کی ڈایری کے عنوانات کے تحت کئی سال تک لکھتے رہے۔ ان دونوں عنوانات کے تحت لکھے جانے والے طنزیہ اور سنجیدہ کالموں کو لوگ بڑے انہماک اور انتظار سے پڑھتے تھے۔ چلنت کا ایک عنوان لیجیے:

"بنام شکر دیوتا وزارتِ شمالی" اس میں وزارت شمالی کے وزیر وزارت سے مزاحیہ انداز میں عوامی مسایل پر خبر لی گئی تھی۔ جب انہوں نے یوگ سبھا کو چھوڑا تو مارتنڈ میں جو ایڈیٹوریل انہوں نے لکھا تھا اُس کا عنوان تھا — تبدیلئ القلب۔

"ہفتہ وار کیسری" اور "ہفتہ وار دیش" یووک سبھا سے مستعفی ہونے پر بندھوجی نے شروع کی۔ "کیسری" کی اشاعت مہاراجہ ہری سنگھ کے حکم سے ۱۹۳۸ء میں بند کی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے "دیش" جاری کیا۔ "دیش" وہ ہفتہ وار اخبار تھا جس نے جاگیرشاہی کے خلاف کشمیریوں کی شکایات اور مطالبات کو نڈر ہو کر زبان دی۔ میں نے اسی ہفتہ وار میں "سوشلزم کیا ہے" ایڈیٹوریل پڑھا ہے۔ بندھوجی بڑے شگفتہ انداز میں اپنا ایڈیٹوریل شروع کرتے تھے جیسے: "چل میرے خامہ بسم اللہ!" — یا — "نئے سال کا راجہ برہسپتی" اسلئے "تاثیر آنکہ" اور بعد میں وہ کشمیری پنڈتوں کی جنتری کے پیش نامے کو لیکر ریاست کے عوامی مسایل پر زوردار تبصرہ کرتے۔ وہ دیش کے ذریعے دیہاتی عوام کے مسایل کی بے باک ترجمانی کرتے رہے اور مہاراجہ ہری سنگھ کی سرکار پر نکتہ چینی کرنے میں بے خوف ہو کر لکھتے رہے۔ ان دنوں دیش کا دفتر آغا حمام کے قریب والے چوک

میں بہ لب سڑک تھا۔ میں نے اکثر ان کو اس دفتر میں کھدر کی پوشاک میں ملبوس اپنے لکھنے کی ڈیسک پر مصروف دیکھا ہے۔

"دیش" کے چند اور اہم ایڈیٹوریل تھے: مسلموں کی کانفرنس۔ زمین کسانان دی اور کے۔ سی اہیدواروں کے لئے گیہں پیپیر۔

جیسے کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کشیپ بندھو پہلی بار سانڈرس قتل کیس کے سلسلے میں لاہور میں گرفتار ہوئے اور بعد میں چھوڑ دئے گئے۔ اسی طرح وہ روٹی ایجی ٹیشن کے سلسلے میں ۳۴-۱۹۳۳ء میں گرفتار ہو کر رہا کر دیئے گئے۔ اس سے پہلے ہی ۱۹۳۲ء میں کشیپ بندھو شیخ صاحب سے جو اُن دنوں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے صدر تھے ملے۔ اس ملاقات کا مدعا یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے تاکہ سب مسایل حل کرنے کیلئے ایک زوردار تحریک شروع ہو اور ریاست میں ذمہ دار نظام حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کیونکہ درحقیقت دونوں فرقوں کے مسایل ایک جیسے تھے۔ اس بارے میں ۱۹۳۸ء کا اگست مہینہ کشمیر کی تاریخ میں ایک اہم مہینہ قرار دیا جا سکتا ہے اسی مہینے میں قومی مانگ (National Demand) مرتب کی گئی اور مکمل ذمہ دار نظام حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔

یووک سبھا کے سٹیج پر جب بندھو جی نے کہا کہ ہری سنگھ کو اپنی فوج جمع کرنے میں ایک دن لگے گا اور مجھے اپنی فوج اکٹھا کرنے میں گھنٹہ بھر درکار ہوگا تو انہیں دوسرے روز گرفتار کر لیا گیا۔

"نیشنل ڈیمانڈ" نے فوراً ایک زوردار تحریک کا روپ اختیار کر لیا میں

خود ان دنوں سرینگر میں زیر تعلیم تھا۔ مجاہد منزل سے لیکر امیرا کدل تک جانیوالے کئی جلوس میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ ان میں سبھی فرقوں کے لوگ شامل ہوتے تھے اور نعرہ تھا۔ "ذمہ دار نظام حکومت - زندہ باد" لوگ جھوم جھوم کر بسمل کا یہ شعر گاتے تھے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اس تحریک کے سلسلے میں شیخ صاحب۔ مولانا مسعودی - مرزا افضل بیگ۔ بخشی غلام محمد۔ کشیپ بندھو۔ جیالعل کلم۔ پریم ناتھ بزاز۔ شمبھوناتھ پشن اور سردار بُدھ سنگھ کو حراست میں لیا گیا۔

مشہور صحافی شری آر۔ کے۔ کاک کے مطابق ۲۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کو فرقہ وارانہ جوش کو ٹھنڈا کرنے اور دونوں فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ڈسٹرکٹ سرینگر کے مجسٹریٹ کے گھر پر جو خاص خاص لیڈر ملے اُن میں شیخ صاحب اور کشیپ بندھو شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ شری بندھو ۱۹۳۱ء سے ہی قومی دھارے کو مضبوط بنانے کے خواہشمند تھے اور اسی لئے وہ جلدی ہی یووک سبھا کو چھوڑ کر نیشنل کانفرنس کے قائم ہونے پر قومی دھارے میں مکمل طور شامل ہو گئے۔

۱۹۴۶ء میں "کوئٹ کشمیر" کا نعرہ بلند ہوا اور یہ نعرہ ایک زبردست تحریک کا موجب بنا۔ چنانچہ کئی رہنما گرفتار ہوئے۔ زور و جبر کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشیپ بندھو نے بھی کئی تقریریں کیں اور انہیں گرفتار کر کے کٹھوعہ جیل میں نظر بند کیا گیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں گاندھی جی اور دیگر قومی لیڈروں

کے دباؤ کی وجہ سے شیخ صاحب اور بندھوجی کے علاوہ دیگر لیڈروں کو بھی رہا کردیا گیا۔ کشیپ بندھو کی گرفتاریوں کے بارے میں ۱۰ر فروری ۱۹۸۱ء کے سرینگر ٹائمز میں صوفی صاحب لکھتے ہیں :

"۱۹۳۱ء سے لیکر ۱۹۶۱ء تک وہ آٹھ سال قید رہے۔ شیخ صاحب کے ساتھ وہ بھدرواہ، ریاسی اور اودھمپور کی جیلوں میں بند رہے۔"

۱۹۴۸ء میں جب شیخ صاحب وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے تو کشیپ بندھو کو، جو اس سے قبل ایمرجنسی ریلیف اور ری ہیبلٹیشن آفسر (Emergency Relief and Rehablitation Officer) تھے، دیہات سدھار کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ اس دوران اُن کے ماتحت دیہاتی ترقی، پنچایت، کواپریٹو، زراعت، اور انمل ہسبنڈری کے محکمے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی اور اہم ذمہ داری تھی، جس سے وہ اچھی طرح عہدہ برا ہوئے۔ انہوں نے "ہلہ شیری" (اپنی مدد آپ) کا نعرہ دیا اور اس طرح کئی دیہات تک رابطہ سڑکیں، بڑی بڑی نرسریاں اور نہریں تعمیر کروائیں۔ ایسے کاموں میں شوپیان۔ اہرہ بل روڈ، نوپورہ۔ بابار یشی روڈ، ڈب آکورہ، تولہ مولہ اور گاندربل کی خاص نرسریاں شامل ہیں۔

۹ر اگست ۱۹۵۳ء میں وہ شیخ صاحب کے ساتھ گرفتار کرلئے گئے۔ جب وہ رہا ہوئے تو بخشی صاحب نے اُنہیں اپنے گروپ کے ساتھ ملانے کے لئے کئی طرح کی پیشکش کی۔ لیکن بندھوجی نے کسی ایک کو بھی منہ نہ لگایا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ صادق سرکار میں پروجیکٹ آفسر سوناواری مقرر

کئے گئے اور اس اہم منصوبے کو انہوں نے بخوبی مکمل کر لیا۔ کُل ملا کر شیخ صاحب نے دس سال کا عرصہ جیلوں میں کاٹا۔ وہ اکثر جیل کے تجربے بیان کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ آدمی جیل میں اپنے ساتھیوں کی ساری خوبیاں اور خامیاں اچھی طرح جان لیتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ایک مرتبہ میں شیخ صاحب کے ساتھ جیل میں تھا۔ اگرچہ میں اُن کی ساری باتوں کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن ایک دن جب انہوں نے غالب کی ایک غزل ترنّم سے پڑھی تو مجھ پر وجد طاری ہو گیا۔ شیخ صاحب کے ہی بارے میں مجھے انہوں نے ایک اور واقعہ سُنایا۔ کہنے لگے کہ ایک دن مجھے شیخ صاحب کے پاس شام کا کھانا کھانا تھا۔ میرے لئے وہ کوفتہ، سبزی یعنی کُوٹا ہوا ساگ تیار کیا کرتے تھے کیونکہ میں سبزی خور تھا۔ زمانہ قبایلی حملے کا تھا۔ پاکستان سے نمک نہیں آرہا تھا اور وادی میں نمک کا کال پڑ گیا تھا۔ جب ہم شام کو کھانا کھانے بیٹھے تو میں نے دیکھا نہ میری سبزی میں نمک ہے اور نہ شیخ صاحب کے سالن میں۔ حالانکہ ان دنوں جو نمک ہندوستان سے آتا تھا اُس کی تقسیم کاری میرے ہی ذمے تھی۔ لیکن شیخ صاحب نے کبھی بھی نمک کے بارے میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی۔ اور نہ کبھی اپنے لئے نمک منگوایا۔

سری نگر ٹائمز کی ۱۰ فروری ۱۹۸۱ء کی اشاعت کے مطابق جب بندھو جی سے ۱۹۵۳ء کی اقتدار کی رسہ کشی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

"۱۹۴۷ء تک تحریک سے وابستہ لیڈر متحد تھے۔ اس کے بعد جب اقتدار ان کے ہاتھ آیا تو کمزور ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی گروپ بندیاں اور گٹھ بندیاں پیدا ہو گئیں۔ اُن کے مطابق لیڈروں کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے کی ذمہ داری مرکز پر بھی

عاید ہوتی ہے۔"

جب بند ھوجی پروجیکٹ افسری سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے کبھی اقتدار میں آنے کی خواہش ظاہر نہیں کی بلکہ ۱۹۷۵ء میں جب شیخ صاحب دوبارہ اقتدار میں آئے اور کشیپ بندھو سے ہاتھ بٹانے کو کہا تو بندھوجی نے کہا کہ اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔

اُن کے خاص دوستوں میں مرزا محمد افضل بیگ، خواجہ غلام نبی سابقہ گورنر اور غلام محمد چکن شامل ہیں۔ بندھوجی نے مجھے بتایا کہ میں نے اور میرے قریبی دوستوں نے وعدہ کیا تھا کہ جب ان میں سے کوئی کما نہ سکے یا جیل میں ہو تو دوسرے لوگ اُس کی مدد کرینگے۔

زندگی کا آخری دور انہوں نے اپنے گھر کی بیٹھک میں ہی گذارا۔ وہ کبھی کبھار سرینگر آتے۔ لیکن اس دوران اُن کے دوست اور عام لوگ اُن سے گھر پر ہی ملتے رہے۔ ایک دوبار شیخ صاحب بھی اُن سے ملنے آئے اور ان کے علاوہ بیگم شیخ عبداللہ، ڈاکٹر فاروق عبداللہ، خواجہ غلام محمد شاہ وغیرہ اُن کی مزاج پُرسی یا مشورے کے سلسلے میں اُن سے ملتے رہے۔ اُن کے خاص دوست تو آتے ہی رہتے تھے۔

وہ زندگی کے آخری دور میں بھی پڑھتے اور لکھتے رہے۔ جو لوگ انہیں خط لکھتے۔ انہیں وہ ضرور جواب دیتے ــــــ ہاں وہ اکثر تنہائی میں راتیں گذارتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے بہت بڑے مکان میں تن تنہا وقت گذارتے۔ میں نے اکثر اُسی تنہائی کے بارے میں ان کو لکھا۔ لیکن وہ ایک مجاہد آزادی کی

طرح تنہائی اور تناؤ سے بھی برسر پیکار رہے۔ اُن کے ایک قریبی رشتہ دار شری گوبند جو رازدان نے مجھے اننت ناگ میں کہا کہ بندھو جی نے اپنی سوانح لکھ رکھی ہے اور اس کی اشاعت کے لئے ایک خاصی رقم بھی محفوظ کرلی ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو ہمیں توقع کرنی چاہیئے کہ اس سوانح عمری سے ہمیں ان کی شخصیت کے کئی اہم گوشوں کی واقفیت بہم ہوگی۔

کئی سال سے میں انہیں خط لکھتا رہا اور وہ ضرور جواب دیکر مجھے اپنی صحت ٹھیک رکھنے کا مشورہ دیتے رہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء کو جو خط انہوں نے مجھے لکھا وہ اس لئے اہم ہے کہ اس خط سے ان کی تاریخ پیدائش پر جو میں نے درج کیا ہے مصدقہ ہونے کی مہر ثبت ہوتی ہے۔ خط کی عبارت یوں ہے:

گیرو ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء

عزیز بھائی۔ بھگوان آپ کو سُکھی رکھے۔

کل میرا جنم دن ہے۔ کہنا یہ ہے کہ عمر کے اسی سال پورے ہونگے اور نئے سال یعنی اکاسویں سال میں قدم رکھوں گا۔ اسی [۸۰] کا دشک ختم ہو گیا اور نوے [۹۰] کے دشک میں داخل ہو رہا ہوں ؎

زندگی تیرے لئے میں نے بہت رقص کیا

اب یہ حسرت ہے کبھی تجھکو نچا کے دیکھوں

آپ کا وہ پوسٹ کارڈ مجھے ٹھیک وقت پر ملا جس میں آپ نے اپنی ماتا جی کے سرگباش ہونے کا سماچار دیا تھا۔ خط پڑھکر میں دیر تک سوچتا رہا مجھے ایسے لگا کہ بھگ سو سال پہلے یا اس سے دس ایک سال زیادہ دو

پریوار ایک زنجیر میں باندھ دیئے گئے تھے۔ مجھے اپنے بچپن کے ایّام یاد ہیں جب
اس زنجیر کی کڑیاں بڑی مضبوط تھیں۔ ذرا سی جنبش پر ھٹن ھٹنا اُٹھتی
تھیں۔ ماحول میں ایک اضطراب پیدا ہوتا تھا۔ زنجیر کی ھٹن ھٹن کی آواز
دیر تک ماحول کو متاثر کرتی تھی۔ اور پھر ایک وقت آیا جب کبھی کبھی زنجیر
میں حرکت آتی تھی۔ لیکن حرکت اتنی خفیف تھی کہ اس میں طاقت صدا نو
نہیں تھی۔ اور بعد میں زنجیر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آپ کی سرگباشی ماتاجی
اس زنجیر کی آخری حرکت تھی جس زنجیر کا سرا اس گھر کے ساتھ جڑا تھا۔ لو
زنجیر ٹوٹ گئی۔ وہ سرا بچھڑ گیا۔ میں نے اپنی مرحوم دادی کو یہ ہدیہ کہتے اور
بولتے سنا تھا :

" اَمی گرِ ج کوٗر اٗسس ، اَمی گرِ ج بٮ۪نہِ اٗسس ، اَمی گرِ ج پوپھ
اٗسس تہٕ اَمی گرِ ج کوٚس ناٗنی "

(یعنی میں اسی گھر کی بیٹی تھی۔ اسی گھر کی بہن تھی۔ اسی گھر
کی پھوپھی۔ اسی گھر کی نہ جانے کیا تھی)

میرا بھائی اور اس کی پتنی دسمبر میں باہر گئے ہیں۔ ابھی واپس نہیں
آئے۔ آپ کا خط میں نے جب ..... کو سنایا وہ خالی نظروں اور خالی
ذہن سے میرے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہی وقت کے ساتھ ہوا ہے
ایک بھولی بسری کہانی، ایک بیکار سی لذت فرسودہ کتاب۔ یہ تصور کرتا تھا
شاید کبھی میری مرحوم دادی نے کہا ہوگا ؂

یاد آئیں گے زمانے کے مشاقوں کے لئے جیسے فرسودہ کتابیں نوجوانوں کے لئے

میں آپ کو خط لکھ نہ سکا۔ کچھ سردی، کچھ کاہلی، کچھ پیری۔ سب نے مل کر مجھے قلم برداشتہ اور دل برداشتہ بھی بنا دیا ہے۔ دو دن سے گرمی ہے۔ باہر دھوپ میں بیٹھا پیروں کو گرمی پہنچاتا رہا۔ لگ بھگ بیس ایک خطوط کا جواب دینا ہے: گٹھڑی کھول کے بیٹھا ہوں اور لکھ رہا ہوں۔ ...... آپ کی صحت کا کیا حال ہے۔ بھگوان آپ کو سُکھی رکھے۔

کشیپ بندھو

ایک اور خط میں ذکر کرتے ہیں کہ میرا خط ایک لمبے عرصے کے بعد انہیں ملا۔ حالانکہ خط کو صرف بائیس میل کا سفر طے کرنا تھا۔ خط اس لئے دیر سے پہنچایا گیا کہ آزادی کے بعد ملک میں ہر کام کی آزادی ہے۔ اس لئے خط بھی دیر سے ملتے ہیں۔ ایک اور خط میں انہوں نے مجھے لکھا کہ جب میں اُن کے پاس آؤں تو اپنی تازہ نظمیں ساتھ لیتا چلوں تاکہ وہ دیر تک یہ نظمیں سُنتے رہیں میری ایک لمبی نظم سُنانے کے بارے میں بھی انہوں نے مجھے لکھا تھا۔

۱۸ دسمبر ۱۹۸۵ء کو وہ معمول کے مطابق کام کرتے رہے۔ جب اُن کے ایک ملازم نے آکر کہا کہ اُنکی گائیں آج گھاس نہیں کھا رہی ہیں تو انہوں نے کہا کہ وہ آج گھاس نہیں لیں گی شاید وہ کہنا چاہتے تھے کہ آج ہی اُن کا مالک آخری سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔ اسی روز شام کوئی آٹھ بجے کے قریب اُنکی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

کشمیر کی صحافتی اور سیاسی تاریخ میں بندھو جی کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہیگا۔ وہ تنگ نظری سے بالاتر تھے۔ اُنہیں آرین تہذیب بیحد پیاری

ماسٹر زندہ کول
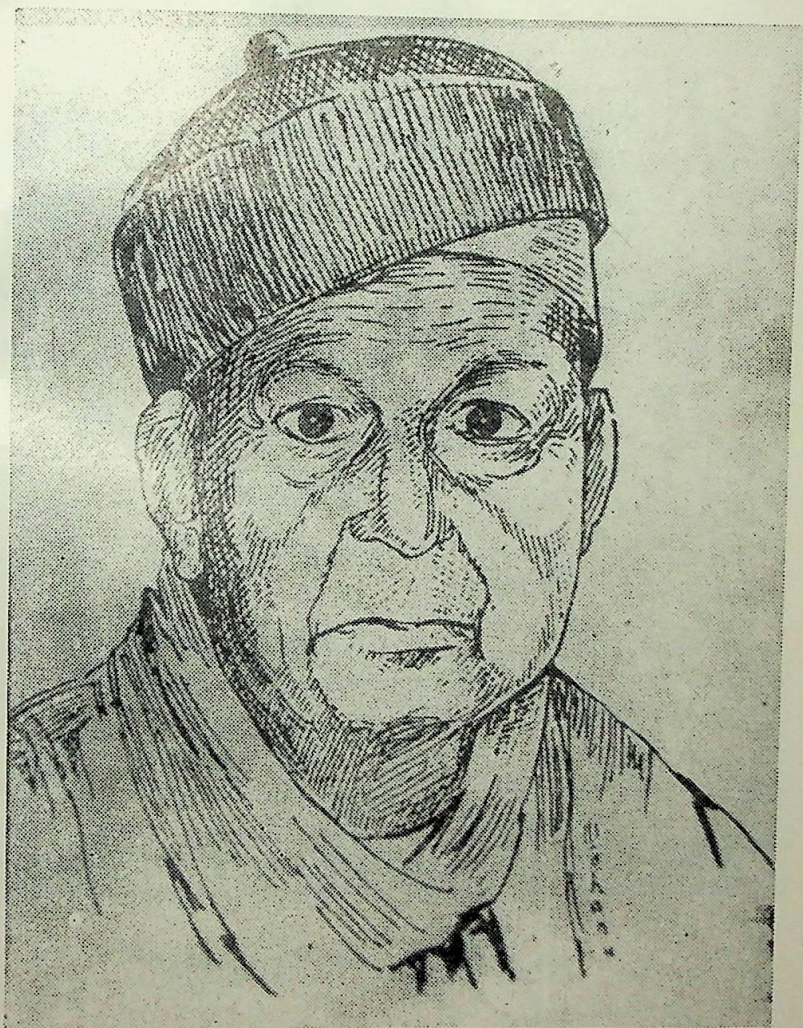
محمد امین داراب

مئی ۱۹۴۱ء کی بات ہے جب راقم الحروف پنجاب یونیورسٹی لاہور سے عربی میں آنرز ان عربک (مولوی فاضل) کر کے اورینٹل کالج انجمن نصرۃ الاسلام سرینگر کشمیر کے تدریسی سٹاف میں نیا نیا شامل ہوا تھا۔ مرحوم میر واعظ مولوی عتیق اللہ متوفی ۲۴، ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ = (منگل، ۷ اپریل ۱۹۶۴ء) کے منجھلے فرزند مولوی نورالدین صاحب، حال مقیم پاکستان، ہمارے وائس پرنسپل تھے۔ اس موقعہ پر مولوی نورالدین صاحب شام کے چار یا پانچ بجے بلا ناغہ راجوری کدل سے چل کر خواجہ محمد امین داراب (مرحوم) کے مکان واقع طارٹہ پہنچتے، اور پھر یہاں سے دونوں حول کے راستے سنگین دروازہ واقع محلہ زاہد پورہ سے، بادام واری جاتے اور آس پاس کے علاقے کا چکر کاٹ کر سر شام

اپنے اپنے گھروں کو مراجعت کرتے تھے۔ اس سیر میں کبھی کبھی راقم الحروف بھی ہمراہ ہوا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ماسوائے کسی وقتی مصروفیت کے اگست ۱۹۴۷ء تک جاری رہا جب سیاسی خلفشار کی بناء پر ملک ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہوگیا۔ داراب صاحب ہندوستان میں رہے اور مولوی نورالدین صاحب نے پاکستان کو اقامت کے لئے چن لیا اور اس طرح تقسیم ہند کے ساتھ ہی دونوں کی رفاقت سیر بھی اختتام کو پہنچ گئی۔ تاہم راقم کے دل پر اُس وقت کی سیر کے نقوش کالنقش فی الحجر (پتھر کی لکیر) کی طرح آج بھی ثبت ہیں۔ دونوں کے سروں پر سفید دستاریں جو کشمیر میں بیسویں صدی کے پانچویں عشرہ کا طرۂ امتیاز تھا، سر پر برف کی طرح چمکتی تھیں۔ دونوں کے جسموں پر اچکنیں ہوتی تھیں البتہ خواجہ محمد امین داراب صاحب ہاتھ میں انگشتِ شہادت یا اُس سے قدرے موٹائی کی جریب بردار ہوتے تھے۔ داراب صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے ملاقات سرِراہ چلتے چلتے ہوا کرتی تھی۔ ان ملاقاتوں سے داراب صاحب کے متعلق مجھے جو اندازہ ہوا وہ یہ تھا کہ مرحوم انتہائی خوددار اور قدیم طرز کے وضعدار شریف تھے نہایت آن بان اور شان وشوکت کے ساتھ صاف ستھرے مگر اعلیٰ لباس میں ملبوس رہا کرتے تھے۔ کشمیر کی روایتی طرز اور وضعداری کا خاص خیال تھا۔ غالباً اس وجہ سے بھی کہ کشمیر میں بیسویں صدی عیسوی کا نصف اوّل جدید مغربی تہذیب سے اتنا زیادہ قریب نہ تھا جتنا کہ آج مشاہدہ میں آرہا ہے اور یا پھر اس وجہ سے بھی کہ ان کی فطرت ہی قدیم روش کی دلدادہ تھی اور پھر یا یہ

کہ قدیم رہن سہن اور تہذیب کی چھاپ ان پر شدید قسم کی گہری تھی۔ مختصر یہ
کہ کشمیر کی روایتی اور آبائی تہذیب اور اندازِ فکر ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا
اور انہیں مناظر قدرت اور سیر سپاٹے کے زبردست شوقین تھے۔

یہ تو تحقیق سے معلوم نہ ہو سکا کہ داراب صاحب نے اپنی فارسی یا اردو
کی تعلیم کس مکتب یا کس بزرگ استاد سے حاصل کی تاہم اتنا امر یقینی ہے کہ
داراب صاحب نے اپنی فارسی یا اردو کی تعلیم کس مکتب یا کس بزرگ استاد
سے حاصل کی تاہم اتنا امر یقینی ہے کہ داراب صاحب بیسویں صدی کے موجودہ
کشمیر میں فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ جب کبھی مرحوم سے سرِ راہ ملاقات
ہوئی تو یا تو کشمیر کے فارسی شعراء کا تذکرہ اور یا موجودہ دور میں لوگوں کی اُس
عمدہ اور شیریں زبان سے بے اعتنائی کا شکوہ زبان سے سُنائی دیا۔ داراب
صاحب کو کشمیر کی روایتی اور قدیم تہذیب کے ہاتھ سے جانے کا انتہائی دُکھ
تھا۔ (مرحوم) پروفیسر محمد طیّب شاہ صاحب صدیقی ضیغم کو بھی راقم نے
فارسی شعر و ادب کا بحرِ ناپیدا کنار پایا تاہم قدیم تہذیب اور کشمیر کے روایتی
رسم و رواج کے ہاتھ سے چلے جانے کا جس شخص کو شدید احساس تھا وہ صرف
داراب اور خواجہ محمد امین صاحب داراب تھے۔ یہ تھا راقم الحروف کی متعدد
ملاقاتوں کا ماحصل جو راقم الحروف نے دوران گفتگو داراب صاحب سے اخذ
کیا ہے۔

خواجہ محمد امین داراب سے راقم کی ملاقات بالعموم نائد کدل پر ہوا کرتی
تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب نالۂ مار پر واقع اس کدل (پل) کو پاٹا

نہیں کیا تھا اور اس بناء پر یہ ملاقاتیں ۱۹۵۰ء سے پہلے کی قرار دی جاسکتی ہیں
کیونکہ یہی وہ سال ہے جب سرینگر، کشمیر کا یہ تاریخی سانپ کی طرح بل کھاتا
ہوا نالہ خواجہ غلام محمد صادق کے دور حکومت میں پاٹ کر زمین کے ساتھ ہموار
کر دیا گیا اور اب اس نالہ کا نام صرف صفحاتِ تاریخ کی زینت بن کر رہ گیا ہے
اسی پل پر داراب اور راقم الحروف فارسی شعر و ادب کے مختلف موضوعات
پر کھڑے کھڑے طویل مدت تک محوِ گفت گو ہوا کرتے تھے۔ اس سے مرحوم کے
علمی مزاج اور ملنساری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں راقم نے انہیں
انتہائی شگفتہ اور سلجھا ہوا انسان اور رفیق پایا۔ مرحوم نے راقم کی معلومات
میں گھٹانے کے بجائے ہمیشہ اضافہ ہی کیا۔ اُن کی بدولت مجھ پر کشمیر کے فارسی
شعر و ادب کے ہمیشہ نئے پہلو نمایاں اور روشن ہوئے۔ اگرچہ خود کشمیر میں فارسی
کے آخری اور قادر الکلام شاعر تھے لیکن مقابلتاً کبھی بھی کسی معاصر شاعر کا
تذکرہ بُری زبان یا حقارت سے نہیں کیا جو شاعر کی عظمت کی دلیل ہے۔

کشمیر میں داراب تخلص یا نام کے دو شخص ہوئے ہیں ایک مُلّا ساطع
کا فرزند میرزا داراب جویا اور دوسرے محمد امین داراب۔ فرق یہ ہے کہ داراب
پہلے شخص کا نام اور جویا تخلص تھا جبکہ دوسرے کا داراب تخلص اور نام محمد
امین تھا۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ میرزا داراب جویا مذہباً شیعہ اور مرحوم
محمد امین داراب راسخ العقیدہ سُنّی تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خواجہ محمد
سخی جو اس خاندان کے ایک مشہور فرزند تھے اور تجارت میں نمایاں کامیابی
کی بدولت ملک التجّار کہلاتے تھے، اور جن کی تجارتی کوٹھیاں حیدرآباد، لکھنو

اور بمبئی میں قایم تھیں۔ ان کے فرزند خواجہ سعدالدین درابو، المتخلص بہ سائل نے ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ و ۱۸۵۶ء میں آستانِ حضرت سلطان مخدوم حمزہ کشمیری علیہ الرحمتہ کی مرمّت پر یہ تاریخی قطعہ منظوم کیا تھا:

بہ تاب وآب آب و تاب بُرد از مہرِ عالمتاب

تعالی اللہ چنین باید درِ عالی جناب ما

بحالِ ما کہ کحلِ دیدہ از خاک درت داریم

نگاہے بس بود اے ذرّہ پرور آفتابِ ما

ملک دست دُعا برداشت من آمین کُنان گفتم

الٰہی باد در ہر باب زین در فتح باب ما

۱۲۷۲ھ

سائل نے یہ قطعہ جیسا کہ اس کے مضمون سے مفہوم ہوتا ہے آستان حضرت مخدوم علیہ الرحمتہ کے دروازہ کے لئے لکھا تھا جو انہی ایام میں نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ خواجہ سعدالدین کی متابعت میں خود خواجہ محمد امین داراب نے نہ صرف آستان مخدوم حمزہؒ کی تعمیر جدید' بلکہ مسجدِ بابا داؤد خاکی علیہ الرحمتہ کی نئی تعمیر پر یہ تاریخی قطعات' جو اِن بقعات عالیہ کے دروازوں یا ڈیوڑھیوں پر کندہ ہیں' منظوم کئے ہیں۔ حوضِ حضرتِ مخدومؒ کی تکمیل پر داراب مرحوم نے یہ تاریخی شعر کہا ہے:

وہ برآمد از لبِ فوّارہ چوں داراب دوش

سالِ اتمامش نوشتہ "حوض پُر آبِ شفا"

"حوض پُر آبِ شفا" کے اعداد بحساب حروفِ جمل ۱۴۰۰ ہوتے ہیں۔ لیکن جب ان سے وہ کے اعداد گیارہ منہا کئے جائیں، تو ۱۳۸۹ کے اعداد باقی رہتے ہیں اور یہی تعمیرِ فوّارہ کی تاریخ ہے۔ ۱۳۸۹ھ کا سال انگریزی میں ۱۹۶۹ء کے مساوی ہے اور مسجد بابا داؤد خاکی کی تعمیرِ جدید کا قطعۂ تاریخی یہ ہے۔ یہ مسجد قلعۂ اکبری کی فصیل کے اندر متصل آستانِ مخدوم رح دروازہ بسطرف شمال واقع ہے۔ بہرکیف قطعۂ تاریخی حسبِ ذیل ہے:

بود چوں باعث بہ دشواریٔ و ضیقِ راہِ عام

کندہ زان از جائے خود اینجا نباشد تارود

سال تجدیدش چو شید اجست از دآراب گفت

مسجد داؤد خاکی جو بہ تبدیلِ مقام

۱۳۹۱ھ

یعنی نہ کم چہاردہ صد ہشت ہجری ہمچنیں

بست و نہ کم دو ہزار آمد مسیحی والسلام

۱۹۷۱ء

دآراب در اصل لفظ درابو کا مُعرّب ہے۔ ہمارے زیرِ بحث دآراب صاحب اسی خاندان کے ایک فرد تھے۔ مطابق تحقیق مرحوم محمد الدین فوق مُصنّف تاریخ اقوامِ کشمیر (صفحہ ۳۵۹ و ۳۶۰) درابی یار سرینگر، کشمیر کے ایک محلہ کا نام ہے۔ چنانچہ اس محلہ سے جو شخص بھی کسی دوسرے محلّے میں بغرضِ رہائش گیا وہ محلہ درابی یار کی مناسبت سے درابو کہلایا۔ یہ محلہ دراصل انہی لوگوں کے نام پر درابی یار مشہور ہے۔ درابی یار شہر کدل میں ایک مشہور محلہ ہے۔

ایک روایت کے مطابق افغان عہدِ حکومت میں ایک شخص دُریہ گام سے شہر سرینگر میں نروره (متصل عیدگاہ) کے ایک پشمینہ فروش کے پاس ملازم ہوگیا تھا۔ بعد ازاں پنجاب میں آقا کا گماشتہ ہوگیا اور اخیر پر فرخ آباد، یو پی میں ایک عظیم کارخانے کی بُنیاد ڈالدی۔ کشمیر میں خاندانِ درابو کے اہم اور نامور افراد خواجہ خلیل درابو اور خواجہ سبحی درابو تھے۔ خواجہ سبحی درابو کو درویش کرم شاہ متوفی ۲۸ ماہِ رمضان ۱۲۷۱ھ (جمعرات، ۱۴ جون ۱۸۵۵ء) سے اعتقاد تھا۔ انہی خواجہ سبحی درابو کے فرزند خواجہ سعدالدین درابو تھے جنہوں نے علاوہ تجارت کے شاعری میں بھی بڑا نام پیدا کیا تھا۔ خواجہ سلام الدین، خواجہ محمد امین اور خواجہ امیرالدین اس خاندان کے دیگر مشہور افراد ہیں۔

لیکن مرحوم پروفیسر عبدالقادر سروری مؤلف "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" (صفحہ ۳۱۹) کے مطابق خواجہ محمد امین داراب کا سلسلۂ نسب کشمیر کے پہلے مسلمان حکمران رینچن شاہ المعروف بہ صدرالدین تک پہنچتا ہے۔ کوٹہ رانی کے بطن سے رینچن شاہ کا ایک بیٹا حیدر نامی تھا۔ خودکشی سے پہلے ماں نے بیٹے کو کشمیر سے چلے جانے کی وصیت کی تھی اور اس بناء پر حیدر ایران و ترکستان کے قافلے کے ساتھ کشمیر سے باہر چلا گیا تھا۔ آئندہ چل کر اسی حیدر کے پڑپوتوں میں محمد مقیم نامی ایک شخص دوبارہ وسط ایشیا سے آکر ساکن کشمیر ہوگیا تھا۔ سرینگر کشمیر کے محلہ نوشہرہ میں اس محمد مقیم کی تجارتی کوٹھیاں تھیں اور یہیں سے دساور کو مال روانہ کیا کرتا

تھا۔ اس کی رُو سے اس خاندان کے تعلقات خطّۂ یو پی سے نہایت زیادہ تھے
چنانچہ خاندانِ درابو کے کئی اشخاص نے جن میں خواجہ محمود اور خواجہ عزیز الدین خاص
طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھنو کو مستقل سکونت کے لئے اختیار کر لیا تھا ہمارے
موضوعِ بحث مرحوم خواجہ محمد امین داراب کے والد ماجد ہیں۔ خواجہ نور الدین
اسی خاندان کی ایک مشہور و معروف اور سرکردہ شخصیت تھے۔

خواجہ محمد امین داراب ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ - ۱۸۹۱ء) میں پیدا ہوئے
ان کے والد خواجہ نور الدین چونکہ فارسی زبان کے اچھے خاصے عالم تھے اس لئے
داراب صاحب کی تاریخِ ولادت انہوں نے فقرۂ "گُل ارغوان) سے نکالی
تھی جو بحساب حروفِ جمل ۱۳۰۸ کے عدد کے مساوی ہے اور باعتبار سنہ
ہجری سال ولادت ہے۔ خواجہ محمد امین داراب کی تعلیم قدیم طرز پر فارسی
میں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ اس زبان کا ذوق ان کی فطرت میں رچا بسا ہوا
تھا۔ آپنے اپنے زمانے کے مشہور علماء مولوی غلام محمد زہگیر، پیر عبد العلی
پاندانی اور مولانا سید میرک شاہ اندرابی سے تعلیم حاصل کی۔ اپنے زمانہ کے
اہلِ علم اور فارسی گو شعراء سے ان کے نہایت گہرے اور دیرینہ تعلقات تھے۔
ان میں قابلِ ذکر پیر شمس الدین حیرت کاملی، سید مبارک شاہ فطرت اور
پیر عبد القادر آثم ملارٹی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ پیر شمس الدین حیرت
اور خواجہ محمد امین داراب صاحب سنہ ہجری کے ایک ہی سال یعنی ۱۳۰۸ھ
میں متولد ہوئے تھے اور دونوں نے فارسی کے اخیر زمانے میں کشمیر میں نام پایا۔ ان
کے علاوہ خواجہ محمد امین داراب کے معاصرین میں خانصاحب منشی سراج الدین

احمدؔ، میر غلام رسول نازکیؔ، پیر نجم الدین عشرتؔ، عبدالحق برقؔ، خواجہ محمد امین بچھ، مرزا کمال الدین اور پنڈت نند لال کول طالبؔ تھے۔ کشمیر کے میر واعظ خاندان سے اُن کے اور اُن کے خاندان کے انتہائی دیرینہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب تک مرحوم میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحب تقسیم ہند کے باعث اہلِ خاندان سمیت پاکستان نہیں گئے تھے خواجہ محمد امین داراب وقتاً فوقتاً میر واعظ منزل آیا کرتے اور بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ میر واعظ مولانا عتیق اللہ صاحب کے منجھلے فرزند مولوی نور الدین داراب صاحب کے مکان واقع پاندان آیا کرتے تھے۔ بقولِ پروفیسر عبدالاحد صاحب رفیق سید مبارک شاہ فطرت نے وادیٔ کشمیر میں علمی و ادبی سرگرمیوں کے احیاء کے سلسلے میں باقاعدہ ایک ادبی انجمن "بزمِ اخوان الصفا" کے نام سے قائم کی تھی اور دیگر ارکان کے ساتھ اس بزم کے ایک رکن مرحوم خواجہ محمد امین دارآب بھی تھے (ملاحظہ ہو ہمارا ادب، شخصیات نمبر ۱۹۸۴-۱۹۸۵ء ص ۱۹۱)۔ اس بزم کے اہتمام سے ہر سال مولانا فطرتؔ کے دولت کدہ پر مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور داراب صاحب خاص طور پر ان میں حصّہ لیا کرتے تھے۔

خواجہ محمد امین داراب کا گھرانہ قدیم زمانہ سے سلطان العارفین حضرت شیخ مخدوم حمزہ کشمیری علیہ الرحمۃ کا معتقد رہا ہے۔ چنانچہ اس خاندان کے ایک بزرگ خواجہ سعد الدین درابو جو خواجہ سخی درابو کے فرزند تھے اور سائلؔ تخلص کرتے تھے اور جن کا تذکرہ[1] حسن نے کشمیر کے فارسی شعراء کے ضمن میں

---

[1] خواجہ سعد الدین سائل کے متعلق حسن کا بیان یوں ہے: (اگلے صفحے پر دیکھئے)

کیا ہے۔ حضرت مخدوم حمزہؒ کے خاص طور پر معتقد تھے اور اس ضمن میں ۱۲۸۲ھ میں حضرت سلطانؒ کے آستان کے دروازہ کی مرمت بھی کروائی تھی خاندانی اعتقاد کے پیش نظر مرحوم محمد امین دار آب بھی اس عقیدت سے مستثنیٰ نہ تھے چنانچہ بارہا آستان حضرت مخدومؒ پر جاکر اظہار اعتقاد و عجز و نیاز کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے آستانِ حضرت مخدومؒ کے حوض کی منظوم تاریخ کہی ہے۔ اور اسی طرح مسجد بابا داؤد خاکی کی جدید تعمیر کی تاریخ کو بھی موزوں کیا ہے۔ یاد رہے کہ بابا داؤد خاکی شیخ المشایخ سلطان مخدوم حمزہ کشمیری علیہ الرحمتہ کے خلیفۂ بلا واسطہ تھے، اور اس کا ثبوت وہ قصیدہ ہے جو بابا داؤد خاکی نے حضرت مخدومؒ کی شان میں قصیدۂ وِرد المریدین کے عنوان سے کہا ہے اور جس کی شرح خود ان کی تصنیف دستور السالکین کے عنوان

(پچھلے صفحہ کا فٹ نوٹ) "فرزند خواجہ محمد سخی در ابواز بخیائے شہر و فصحائے عصر در حُسن تحریر و حُسن تقریر فردِ بے نظیر بود، و در سخندانی و درک معانی دلپذیر صاحبِ طبع رسا و معدنِ ذہن و ذکا و مخزنِ فطرت و دہا بود۔ سائل تخلص می داشت۔ در نعت و منقبت اشعار نیکو بسیار گفتہ است، از انجملہ این مخمس دارد :

کیست دانی بجہان نایب حق بے شک و شین
خاندانِ نبوی را کہ بود زینت و زین
بہ تقا وارث شیخین، بحیا ذوالنورین
قُرّۃ العین علی، سبط حسنِ آلِ حسین
دستگیرِ دو جہان حضرت غوث الثقلین

سے ہے۔

یہ امر کہ خواجہ محمد امین دارآب مرحوم خواجہ سعدالدین شائل کے خاندان سے تھے اس کا اندازہ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کے اس بیان سے جو انہوں نے "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" صفحہ ۳۱۳ پر کیا ہے، ہوتا ہے۔ سروری[1] مرحوم رقمطراز ہیں:

"کشمیر کے ایک مشہور صاحبِ ذوق علم دوست خاندان کے مختلف افراد نے مختلف زمانوں میں علم و فضل اور شعر و ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں۔ خواجہ محمد امین دارآب، جن کا ذکر اگلے باب میں آرہا ہے، اسی خاندان سے ہیں۔ خواجہ سعدالدین شائل انہیں کے اسلاف میں سے تھے۔ شائل پیشہ ور شاعر نہیں تھے، لیکن اُن کا ذوقِ شعر پاکیزہ تھا۔ اس خاندان میں پشمینہ کی تجارت سالہا سال سے نسلاً بعد نسل چلی آتی ہے۔ شائل کی تجارتی کوٹھیاں بھی برطانیہ اور فرانس میں قائم تھیں۔ خواجہ عزیزالدین عزیز جن کا ذکر خواجہ امین دارآب کے سلسلے میں آیا ہے، شائل کے چچیرے بھائی تھے۔"

---

[1] عبدالقادر سروری ۱۹ اگست ۱۹۰۶ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں اُن کا تقرر جموں و کشمیر یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو و فارسی کی حیثیت سے ہوا اور انتقال تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو اُن کی طبیعت بگڑ گئی اور جانبر نہ ہو سکے۔ جواہر نگر، سرینگر کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔ مرحوم عبدالقادر سروری کے متعلق مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو "ہمارا ادب ۱۹۸۴-۸۵ء شخصیات نمبر ۱" از صفحہ ۲۵۱ - ۲۷۰، از ڈاکٹر برج پریمی۔

مرحوم خواجہ محمد امین داراب کا مشغلۂ زندگی باپ کی متابعت میں پشمینہ کی تجارت تھا۔ لیکن وہ خود فرصت کے اوقات میں شعر و سخن سے بھی شغل رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بھی کہ کشمیر کی پرانی تہذیب اور روش کے دلدادہ تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ فطرت کی طرف سے شاعری کے متعلق طبیعت موزوں پائی تھی۔ خاندانی روایت کے برعکس داراؔب صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ وطن مالوف سرینگر کشمیر میں بسر ہوا لیکن علمی و ادبی تحقیقات کے سلسلے میں دہلی، لکھنو اور رامپور کا سفر کیا تھا۔ یہ سفر غنی کشمیری کی شاعری اور اس کے دیوان کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں تھا جسے کلچرل اکیڈیمی نے شایع کیا ہے۔

خواجہ محمد امین داراب بعمر ۹۱ برس ہجری خدا کو پیارے ہوگئے۔ حافظ عبدالرحمٰن وفائیؔ کی روایت کے مطابق محمد امین داراب زندگی کے آخری برسوں میں موت کے ہر وقت متوقع تھے۔ چنانچہ اس حقیقت کے پیش نظر انہوں نے "غفران محیط" کے فقرہ سے اپنی تاریخ وفات خود کہی تھی۔ اس کے حساب سے اُن کی وفات ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۸ء ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن خلاف توقع آپکا وصال متذکرہ صدر برس کے ایک سال بعد ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں ہوا یہ بات مدِ نظر رکھتے ہوئے ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے نئی تاریخ وفات منظوم کروائی گئی۔ یہ تاریخ حسب ذیل اشعار میں آپ کے لوحِ مزار پر نہایت خوش خط خطِ نستعلیق میں کندہ ہے۔[۱] تاریخ گو شاعر اور کاتب کا نام معلوم

[۱] پروفیسر ابراہیم سے قبل داراؔب صاحب سے متعلق مضمون لکھنے (باقی اگلے صفحہ پر)

نہ ہوسکا۔ بہرکیف خواجہ محمد امین صاحب داراب کے سنگِ مزار پر جو منظوم فارسی تاریخ کندہ ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"یا حیّ یا قیوم

ز داراب خوش دل چہ پرسی مزید | زمانہ چو او خوش مزاجے ندید
چہ خوش گوی و خوش خوی خوشرو بُدہ | چو آہوئے صحرا ز یاران رمید
گُل ارغوان سان بکشمر دمید | خدایش نگہبان شد و امن دید

(پچھلے صفحہ کے فٹ نوٹ کا بقیہ:) کی درخواست اُن کے ایک اور ہم عصر خواجہ محمد امین بچھ سے کی گئی تھی جنہوں نے کافی عرصہ بعد یہ کہکر معذرت کی کہ مرحوم داراب صاحب کے لواحقین اُن کے کلام سے، جو کہ اُن کے پاس محفوظ ہے، استفادہ نہیں کرنے دیتے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میری داراب صاحب کے نواسے جناب سیف الدین درابو سے ملاقات ہوئی تو ان سے اس سلسلے میں شکایت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی بھی نہیں آیا۔ تعاون نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات بات میں داراب مرحوم کی غلط تاریخ وفات کی بات چلی تو سیف الدین صاحب نے بتایا کہ داراب صاحب مرحوم نے جو تاریخ خود لکھ رکھی تھی، ان کی وفات پر میں خود مذکورہ تحریر لیکر مولانا فطرت صاحب کے دولت خانہ واقع مدین صاحب گیا اور مولانا صاحب سے گزارش کی کہ اسے ایک نظر دیکھکر مجھے لوٹا دیں (کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ انہوں نے پہلے ہی لکھی تھی) اس وقت وہاں پر جناب محمد امین بچھ بھی موجود تھے۔ چنانچہ مولانا فطرت صاحب نے یہ تحریر دیکھی اور "ٹھیک ہے" کہکر مجھے لوٹا دی۔ ہم چونکہ بالکل مطمئن تھے اس لئے ہم نے اُسے اُنکی تُربت پر کھُدوایا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو غلط ہے۔ ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب) - محمد احمد اندرابی۔

چو امن و گلِ ارغوان شد بہم "بباغ ارم سوئے مولا" دمید[1]

تعویذِ قبر کی مشرقی جانب فارسی ہی میں سنہ ہجری و عیسوی کی یہ تاریخ کندہ ہے:

سال ہجری چاردہ صد یک کم است عیسوی ہم بست و یک کم دو ہزار
۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء

"اکتوبر ۱۹۸۰ء ۔ تنصیب کلچرل اکادمی سرینگر، بعہد شیخ محمد عبداللہ"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ داراب مرحوم کی قبر پر تاریخ کا پتھر کلچرل اکادمی کی مساعیٔ و اہتمام سے مرحوم کی وفات کے ایک سال بعد نصب کروایا گیا ہے۔ خواجہ محمد امین داراب کی قبر نزورہ سرینگر کے متصل محلہ کھی دن میں اُن کے خاندانی مزار میں موجود ہے۔ راقم نے ۲۳ اگست روز سنیچر ۱۹۸۶ء کو بہمراہیٔ و رہنمائی جناب مولانا حافظ عبدالرحمان صاحب وفائی اس مزار کا مشاہدہ کیا ہے اور مزار داراب کے متعلق متذکرہ صدر معلومات انہیں کی بدولت حاصل ہوئی ہیں۔ نزورہ عیدگاہ سرینگر کشمیر کے متصل بطرف مشرق ایک مشہور محلہ ہے اور قدیم سے درابو خاندان کی رہائیش گاہ ہے۔

---

[1] آخری شعر میں لفظ امن اور گلِ ارغوان کے اعداد کے امتزاج سے زندگی کے سال معلوم ہوتے ہیں اور فقرہ "بباغ ارم سوئے مولا" کے مجموعی اعداد سالِ وفات کا اظہار ہیں۔ ان اعداد کی تعداد ۱۳۹۹ ہے اور یہی داراب مرحوم کا سالِ وفات ہے۔ متذکرہ صدر تاریخ کی خامی یہ ہے کہ یہ روزِ وفات اور مہینہ کے متعلق یکسر خاموش ہے۔

خواجہ محمد امین داراب نے رسم زمانہ کے مطابق علاوہ علوم عربیہ و فارسیہ
کے انگریزی اور اُردو زبانوں کی تحصیل بھی کی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں باقاعدہ
انگریزی اور اُردو کے مروّجہ اسکولوں میں ان زبانوں کا استفادہ کیا تھا۔ تاہم خاندانی
روایت کے شدت کے ساتھ پابند ہونے کے باعث مرحوم فارسی زبان اور اُس کے
شعر و ادب سے خاص شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے علوم عربیہ و فارسیہ کی
تحصیل مولانا محمد حسین صاحب وفائی خانیاری متوفی ۱۹۴۴ء سے کی تھی۔ داراب
صاحب اگرچہ اُردو کے بھی اچھے خاصے ادیب تھے اور اس سلسلے میں سرینگر کشمیر کے
مشہور اخبار "رہنما" میں اپنے اُردو مضامین بغرض اشاعت بھیجا کرتے تھے
تاہم حقیقی و اصلی شہرت انہیں کشمیر میں فارسی کے آخری شاعر کی حیثیت سے ہی
نصیب ہوئی۔ فارسی شعر و سخن میں خواجہ محمد امین دارآب کا ذوق سخن گوئی اس قدر
اعلیٰ و ارفع تھا کہ سنہ ۱۹۵۴ء میں سفیر ایران متعینہ ہند جب سرینگر کشمیر
تشریف لائے اور کشمیر کے فارسی شعراء کی اپنی قیامگاہ پر ایک محفل مشاعرہ منعقد
کی۔ تب داراب صاحب کے فارسی کلام کی دل کھول کر داد دی۔ اور اُنہیں
فارسی کے چوٹی کے شعراء میں محسوب گردانا۔

فارسی کے قدیم ادب و شعر سے گہرے طور پر مانوس ہونے کے پیش نظر
دارآب کا کلام فارسی کے کلاسیکی شعراء کے رنگ کا حامل ہے۔ چنانچہ اس سلسلے
میں اُن کے کلام کی امتیازی خصوصیت تصوّف کہی جا سکتی ہے۔ اس کے
پیش نظر اس ذیل میں انہوں نے کچھ بعض بہت اچھے اشعار قلمبند کئے ہیں
مثلاً یہ ابیات :

سیرِ سلوک من ببیں عشق و جنونِ من نگر   پوئیم من براہِ حق، روئ دلم بسوی تو

روز و شبم چسان گذشت ہست حساب مختصر   شب بطوافِ کوئے تو، روز بگفتگوی تو

●

بعشق ہر کہ کند کوتہی ز سر بازی   کمند گردنش از گیسوئے دراز آور

ببزم ناز فروشان تو نیز ناز فروش   نیاز ہدیہ بدرگاہ بے نیاز آور

●

از شورِ جنوں ما محشر چہ برانگیزی   اے خلوتیٔ دلہا از جلوہ بپرہیزی

سازِ غزلم دارد رازِ جگرم در دل   سوزِ نفسم باشد محوِ اثر انگیزی

تصوّف و عرفان کے تناظر میں داراب صاحب نے بعض اچھے اشعار

اخلاقیات میں بھی منظوم کئے ہیں مثلاً ؎

نہاد بارِ گرانِ امانتم بردوش   وگرنہ بودہ چہ حاجت بدیں نمود مرا

●

بصدف چوُ دانۂ دُر بزمانہ میہمانم   بوطن بخانہ اندر، نہ وطن نہ خانہ دارم

تصوّف چونکہ جذب اور اعتقاد چاہتا ہے یہاں دانائی اور کج بحثی

نہیں چلتی اس لئے داراب اس تناظر میں فلسفہ کے شدید مخالف ہیں، ملاحظہ ہو:

تو بشوقِ نغمۂ نو جگر دگر بدست آر   کہ صدائے دلکشی ہست بغیر تار سازم

تو ز فلسفہ چہ کوشی کہ کشائی عقدۂ من   چو ہنوز پے نبردہ ملک و فلک براز م

●

جائے کہ جوے از غم صد خرمن عیش ارزد   از بزم دو صد خسرو یک خاطر محزون بہ

حکمت بچہ کار آید، وز عقل چہ بکشاید   جائے کہ بود حیرت، از علم فلاطون بہ

میدرم سینۂ افلاک بہ آہی گاہی افگنم در جگر خاک نگاہی گاہی

خوئے کن دیدن ہر چیز بتعمیق نظر برکشی یوسفی زین دلو ز چاہی گاہی

یہ امر کہ فارسی شاعری میں داراب فارسی کے قدیم اور کلاسیکی شعرا سے

متاثر ہیں، اس کا کسی قدر اندازہ اُن کے حسب ذیل شعر سے ہوتا ہے ؎

اگرچہ ساحتِ کشمیر ساز کلکِ داراب است

نوادر نار او خود از صفاہان است و تبریز است

داراب صاحب نے بعض اشعار مُلّا طاہر غنی کشمیری کے انداز میں

بھی قلمبند کئے ہیں، مثلاً یہ اشعار ؎

شاعر و بے غمی، داراب محال است محال قفس و دام پئ مُرغِ خوش آوازی ہست

●

ہر کہ امروز در آئینۂ فردا بیند رہروانہ ہمہ تن گوش بر آوازی ہست

اور یہ اشعار ڈاکٹر سر محمد اقبال کے رنگ کے ہیں ؎

دانش و علم راہ جو، عشق و جنون رہ بین مستی و ذوق رہنما، در ہر منارۂ نشان

بادۂ عیش و بے غمی ہست برابلہان سبیل جام بخون دل زدن روزی اہل دل نشان

داراب قدرت کی طرف سے ایک خلوت پسند دل لائے تھے اور خود

بھی انہیں اس بات کا احساس تھا، چنانچہ کہتے ہیں ؎

بمحفل آمدم، چوں شمع دل پرداختم رفتم ستادم، سوختم، بگریستم، بگداختم رفتم

چہ می پرسی چہ بودہ حاجتم زین بزم افروزی نظر افروختم، گردن شبی افراختم، رفتم

تنگاپوئے زدم در وادئ امید بے حاصل دویدم، ماندم، افتادم، نفس در باختم رفتم

اور متذکرہ صدر پس منظر میں خدا سے دعا بھی کچھ اسی قسم کی ہے، چنانچہ ؎

سروم مرا تو بار خدایا ثمر بدہ   چون نخل شمع سوز دل و چشم تر بدہ

در جام زادۂ صدف بحر طبع من   آبی کہ ریختہ نشود چون گہر بدہ

مرغ مرا کہ دانہ نچیند ز خرمنی   از خویش آب و دانہ مثالِ دُرر بدہ

تصوّف و عرفان کے ناتے داراب صاحب خواجگانِ نقشبند اور سلطان العارفین شیخ مخدوم حمزہ کشمیری علیہ الرحمتہ کے شدّت سے معتقد تھے۔ اس چیز کے پیش نظر ختم خواجگان میں بالعموم شرکت فرمایا کرتے تھے۔ یہ ختم خانقاہ خواجۂ بزرگ، واقع محلہ سیدداری (نوہٹہ) میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ اِدھر سلطان العارفین رح کی زیارت کے باقاعدہ زائر تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حسبِ ذیل نظم ان کی شان میں نظم کی ہے جس سے دار آب صاحب کا جناب سلطان العارفین رح سے بے پناہ جذبہ اور اشتیاق مترشح ہوتا ہے ؎

امر او را آنقدر جرأت کہ می آرد فرود   بر زمین سجدہ سلطان را سر دیہم افسرش

نہی او را آنقدر ہست کہ اندر بادیہ   جائے گشتن پرورد بر دوش کافر دختر ش

کوثر و تسنیم را دیدم گوارائی نکرد   با جگر تفسیدگانِ آب جوئے خنجرش

جادہ پیمائے رہش را بر گذرگہ شد فلک   مشعل افروز از مہ تابان و مہر انورش

آنکہ باشد ساکن کوئے تو با صد تشنگی   بے نیاز از جنت الفردوس و حوضِ کوثرش

بر درت برخاکِ آن افگندہ دارد خویش را   بو کہ بگذارد سگِ کوئے تو پائے بر درش

سوخت داراب تو اندر آتشِ ہجران کنون   دامن افشان خود بیا برباد دہ خاکسترش

مرحوم داراب انتہائی قسم کے جذباتی آدمی تھے اور ایسا شخص بالعموم

مراثی کہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے زندگی میں متعدد بزرگوں کی وفیات پر مراثی منقول ہیں۔ بقولِ میرے دوست اور رفیق کار غلام رسول مخلص داراب مرحوم نے میرواعظ مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات حسرت آیات پر مرثیہ کہا۔ پیر پیر عبدالقادر آثم ملارٹی کو ان کی وفات پر خراج عقیدت پیش کیا۔ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمتہ کی وفات پر فارسی میں نوحہ پڑھا[1]، اور ۱۹۴۴ء میں جب مولانا محمد حسین صاحب وفائی خانیاری بعمر ۷۳ برس انتقال فرما گئے، تو داراب صاحب نے ایک طویل مرثیہ کے ذریعہ اُن کی یاد صفحۂ زمین پر ہمیشہ کیلئے چھوڑ دی۔ مولانا محمد حسین وفائی پر داراب صاحب کا منظوم خراج عقیدت راقم کو اُن کے فرزند ارجمند مولوی حافظ عبدالرحمان وفائی کے توسط سے دستیاب ہوا ہے۔ یہ مرثیہ ذیل میں بعینہٖ سپردِ قلم کیا جاتا ہے۔

مرثیہ بر وفات حسرت آیات

حضرت علامہ مولوی محمد حسین صاحب وفائی نوراللہ مرقدہ

از چیست کہ دم سوخت ز اندوہ فزائی	از چیست کہ غم می کند این سینہ گزائی
از چیست کہ رگ رخِ من گشتہ ہوائی	از چیست کہ بر رنگ خورد شیشۂ شبنم
از چیست کہ مشکل شدہ از غصہ رہائی	از چیست کہ محفل شدہ در گریہ و زاری
از چیست ز کلکم ہمہ آشفتہ نوائی	از چیست ز چشم ہمہ خونابہ فشانی
از چیست کہ ای مجمع تدریس جدائی	از چیست کہ ای محفلِ تعلیم بموئی

[1] داراب صاحب کا یہ مرثیہ "شورشِ قیامت" کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے اور اسے علی محمد اینڈ سنز سرینگر نے شایع کیا تھا۔ (ایڈیٹر)

بر اہلِ عروض از چہ کند قافیۂ تنگ — در اہلِ علوم از چہ رود بے سر و پائی

ای جامہ چرا این قدر آغشتہ بخونی — ای خامہ بحسرت تو چہ انگشت بخائی

شاید سبب آنست کہ شد ختم گرفتن — تعلیمِ حدیث از لبِ علّامہ وفائی

در قحطِ رجال آہ چہ خدایا چہ کمی بود — کین مردِ دگر داد بما داغ جدائی

آن در روشِ و قول و عمل پیرو سنّت — کاندر رہِ دین کردہ بدین راہ نمائی

بودہ نہ در آموختن آدابِ شریعت — جز زادِ رہ آخرتش علّت غائی

علمش نہ ملبّس شدہ از علم فروشی — حلمش نہ ملوّث شدہ از ناصیہ سائی

در عیشش ہمہ بے واسطۂ سمعہ پسندی — زہدش ہمہ بے شائبۂ زہدِ ریائی

فعلش بری از دمدمۂ خلق فریبی — قولش تہی از طنطنۂ ہرزہ درائی

ای شرحِ بیان بستہ زبان، ہیچ نترسی — ای شمعِ کلام این ہمہ خاموش نشائی

امروز کہ عام است تجاہل ز شرائع — ای آمرِ معروف تو خاموش چرائی

اکنون کہ بہر جاست تلعّب بہ شریعت — چونست کہ بر نہی ز منکر نگرائی

حاشا کہ کند منع فغان صبر کہ اکنون — بر خاطرِ ما شاق شد این دردِ جدائی

گریان ادبا، گاہ ز بس ندبہ طرازی — نالان طلباء آہ کہ استاد کجائی

خون کردۂ دلہا تو ازین نوحۂ جانسوز — ای خامۂ دار آب ندانم چہ بلائی

شد تاب ز دل رخصت و ہم خواب نہ دیدہ — تا خامہ کمر بستہ برین نوحہ سرائی

پُرنور لحد بادش و مسرور روانش

اسمع بعثنا بنبیک یا ربّ دعائی

میرواعظ کشمیر حضرت مولانا محمد یوسف شاہ اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں

تقسیم ہند کے بعد راولپنڈی چلے گئے تھے اور راولپنڈی پاکستان میں ۱۶ رمضان المبارک بعد از افطار روز شنبہ (سنیچر) ۱۳۸۸ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کو بعمر ستتر (۷۷) سال ہجری قمری معبود حقیقی سے جا ملے۔ یہ خبر ریاست بالخصوص وادی کشمیر میں کہرام کا باعث ہوگئی۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مذکور ہوا دارآب صاحب خاندان میرواعظ کے زبردست معتقد تھے اور وفات تک اسی عقیدے پر قائم رہے۔ مولانا کی ہجرت پاکستان سے قبل دارآب صاحب کی بلاناغہ میرواعظ منزل واقع راجوری کدل سرینگر میں رفت و آمد تھی۔ دارآب صاحب مولانا محمد یوسف شاہ کے تبحرِ علمی اور تقوی شعاری سے بیحد متاثر تھے۔ اس پس منظر میں جب سانحہ ارتحال میرواعظ کی خبر سنی تو ان الفاظ میں مرثیہ اور اظہارِ عقیدت کیا۔ مولانا یوسف شاہ صاحب کا انتقال راولپنڈی میں ہوا، لیکن مٹی مظفرآباد کشمیر کی نصیب ہوئی اور اس وقت بطور امانت وہیں سپرد خاک ہیں۔

قطعہ تاریخ وفات و مرثیہ میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحب
از خواجہ محمد امین صاحب داراب مرحوم ؎

این خبر وحشت اثر آورد باد آورخ کران　　گشتہ درہم نظم و خوردہ برہم بزم قال
حیف صد افسوس در ہجرت دریغا کردہ است　　یوسفِ ما، مرشدِ ما، واعظِ ما انتقال
در وجود آمد "بشاورت پرور" و "عابد" بزیست　　شد "شریعت پرور" اوراحال سالِ ارتحال
۱۳۱۱ھ　۷۷　　۱۳۸۸ھ

بوسہ زد پیر خرد بر چشم گریانم چو من　　"عطر اللہ مرقدہ" دوبار گفتم بہر سال

نیز فقرۂ "خراج عقیدت" بھی جو دار آب صاحب کا کہا ہوا ہے مولانا
۱۳۸۸ھ
یوسف شاہ صاحب کی تاریخِ وفات ہے۔

ادب اور شعر کی اہم قسم تاریخ گوئی میں بھی خواجہ محمد امین دار آب کو ملکہ حاصل تھا۔ تاریخ گوئی کشمیر میں فارسی زبان و شعر کے اثر سے آئی اور دیکھتے دیکھتے یہ صنف ادب کشمیر میں اسقدر مقبول ہوئی کہ برصغیر ہند و پاکستان میں جس قدر تاریخ گو شعراء پیدا ہوئے اُن کی مجموعی تعداد صرف کشمیر نے پیدا کی ہے۔ داراب صاحب نہ صرف اشعار میں تاریخ کہا کرتے تھے بلکہ بعض وقت فارسی کے نثری جملے بھی تاریخ بن جایا کرتے تھے۔ پیر عبدالقادر آثم کا انتقال ۱۳۶۴ھ (۱۹۴۴ء) میں ہوا۔ دار آب صاحب نے اس شعر سے تاریخِ ولادت اور تاریخِ وفات نکالی ہے:

زاد "شمعِ ارشادت" آنکہ گوئی "مُردِ شمعِ سخن" بسالِ وفات
۱۳۱۶ھ ۱۳۶۴ھ

دار آب صاحب نے تاریخ گوئی کی روایت غالباً خود اپنے والد خواجہ نور الدین سے حاصل کی تھی کیونکہ جب داراب صاحب متولد ہوئے تھے تو ان کے والد خواجہ نور الدین نے "گُلِ ارغوان" کے تاریخی فقرہ سے اُن کا استقبال کیا تھا۔ بحسابِ حروفِ جمل گُلِ ارغوان کے اعداد ۱۳۰۸ ہوتے ہیں اور یہی عدد باعتبار سنہ ہجری مرحوم کا سالِ ولادت ہے۔ علامہ محمد حسین صاحب وفائی کی ولادت، عمر اور وفات پر یہ جامع تاریخی جملہ کہا ہے:

زادنش "خیر تمام" آمد و عمرش "اُسوہ"، "مانَم اُسوۂ خیر"
۱۲۹۱ھ ۷۲ ۱۳۶۳ھ

ان کے علاوہ داراب صاحب نے تعمیر فوارہ آستان حضرت مخدومؒ اور تعمیرِ نو مسجد بابا داؤد خاکیؒ اندرون بھاچی دروازہ کی تواریخ بھی منظوم کی ہیں اور ان تواریخ کا مفصل ذکر گذشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے اس لئے تکرار تحصیلِ حاصل ہوگی۔

داراب صاحب مرحوم نے فارسی زبان پر قدرت کلام کے باعث مشکل زمینوں میں بھی قافیہ پیمائی کی ہے چنانچہ ذیل کی طویل غزل جو راقم الحروف کو حافظ عبدالرحمان صاحب وفائی خلف الرشید حضرت مولانا محمد حسین صاحب وفائی خانیاری مرحوم کے توسّط سے نقشبندی خاندان سے حاصل ہوئی ہے، سپردِ قلم کی جاتی ہے۔ اس میں ردیف کے تمام الفاظ داراب صاحب کی جدّتِ طبع کے مظہر ہیں:

نگاہِ شوقِ من مشتاقِ روے برق تابستے — کہ ہم خورشید را از دیدنِ او زہرہ آبستے

جبینش مطلعِ حُسن است و نازم حسنِ مطلع را — سراپا ہم بیت ابرویش، چہ فرد انتخابستے

ز قدرت مصرعۂ برجستۂ قدش چو شد موزون — نشد سایہ بہم یعنی کہ مضمونِ لاجوابستے

خوشا روئے دِل افروزت کہ با نظارہ سوزہا — بصبحِ عالمِ امکان طلوعِ آفتابستے

بسالک از رہِ عشقت کجا بہتر مقامستے — بعارف جُز در فیضت نہ جائے فتح بابستے

ز بہرِ سُرمۂ چشمِ فلک زیں رہ غبارستے — برائے عرضِ طاعاتِ ملک ایں دُرّ قابستے

شہِ عالی جناب ایں جا گدائے رہ نشین استے — گدائے رہ نشین شاہنشہِ عالی جنابستے

نوائے کز غمت مضراب دارد دلنوازستے — دعائے کز درت محراب سازد مستجابستے

قضا قصدِ گدائی در گہت راہم عنانستے۔ — قدر عزمِ سوار لشکرت را دو رکابستے

تیر

دریں مکتب الف با تا طفلان دفتر یونان | زاُمّی یک اشارت زان کلید صد کتاب بستے

شود ایمن ز بیم رد ازاں برخویش می نازد | نیازے کز قبولِ آستانت کامیاب بستے

چہ می بینی بروئے من ہمہ تصویر یاس است این | چہ پرسی آرزوئے من کہ این نقشے برآبستے

چو می خوانم "وأنت فیھم" از حیرت فرو مانم | توام چون در دلستی چون دل از غم در عذا بستے

کشد شوقم بخوان زودم کہ بوسم آستانت را | مبادا گم کنم فرصت کہ عمرم در شتابستے

نفس دارآب را تنگی گرفت از درد ناکامی | جگر خون از اضطرار ستے دلش شوق از اضطرا بستے

یہ نظم اگرچہ غزل کا رنگ لئے ہوئے، تاہم نعتِ رسولِ مقبول میں ہونے کے باعث شراب دو آتشہ ہوگئی ہے

ماسوائے چند جدید خیالات کے زبان و بیان کے اعتبار سے خواجہ محمد امین دارآب کا کلام روایتی انداز کا حامل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کشمیر کے فارسی شعراء مُلّا طاہر غنیؔ، لالہ ملک شہید، عبدالحکیم ساطع اور مُلّا توفیق سے زیادہ متاثر ہیں۔

دارآب صاحب بروز پیر ۹ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۷۹ء کو رحمتِ حق ہوگئے۔ حافظ عبدالرحمان صاحب وفائیؔ کے بقول مرحوم سے چار لڑکیاں اور ایک لڑکا مختار احمد یادگار رہا۔ خود دارآب صاحب کے عقد میں خواجہ عبدالعزیز خان والدِ خواجہ غلام محمد خان نقاش عرف گگہ خان کی دخترِ نیک اختر تھیں۔ خواجہ عبدالعزیز خان سرینگر کشمیر کے صاحبِ حیثیت بزرگ تھے اور فتح کدل سرینگر کشمیر میں صاحب کوٹھی تھے میں عرض کرچکا ہوں کہ دارآب نے زندگی میں کشمیر کی مشہور شخصیات کے مراثی

کہے ہیں اور راقم نے اپنی باری پر ان کا یہ مرثیہ قلم برداشتہ منظوم کیا ہے۔ امید ہے کہ اہلِ ادب کے نزدیک موردِ قبول ہوگا :

دیگران را آنکہ نوحہ کرد، شد از ما جدا رحلتش افگندہ ما را در بلاؤ در عنا

نزدِ من این رفتنِ داراب زین عالم چہ بود گوش کن از من شنو از مردنش رفتہ بقا

ہر زمان دیدم بشاشت بر جبینش بیگمان دمبدم از خندۂ شیرین شدہ ما را لقا

محفلِ احباب را یک محفل شعر و ادب مجمع اصحاب را از خوش کلامی واہ وا

کم سخن، کم گو، مگر گفتارِ او درِّ عدن قولِ او احباب را در زندگانی رہنما

از وفاتش مرگ شد بے ربب طاری بر سخن رحلتش کردہ زبانِ فارسی را بے نوا

از ہمیں محزون ابراہیم شد بر فوتِ او زانکہ بودہ در حیاتش صاحبِ فہم و ذکا

من نمی گریہ کنم بر فوتِ داراب آنچنان بروے گریہ می کند ہر کسکہ باشد با صفا

سالِ تاریخِ وفاتش یافتم در دِل چنین

بود از ہجری نود نہ سیزدہ صد دوستا

۱۳۹۹ ھ

مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ

ماسٹر زِندہ کول

غالباً سنہ ۱۹۴۳ء کا موسم سرما تھا۔ برف اتنی گری تھی اور سردی اس شدّت کی تھی کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ میں ایک چھوٹے سے مکان، واقع دوکان سنگین فتحکدل، میں کرایہ پر رہتا تھا۔ کشمیر بزم ادب وجود میں آچکی تھی اور ہر اتوار کو بلا ناغہ اسی مکان کے ایک کمرے میں شعراء کی بیٹھک کا اہتمام ہونے لگا تھا اور مجھے اس بات کا فخر میسر ہو رہا تھا کہ شاعروں کا نمکین چائے کی پیالی سے استقبال کروں۔ مکھن لعل محوؔ زبان و ادب کی خدمت میں میرے دست راست تھے، ابھی کالج میں زیر تعلیم تھے مگر اس خدمت کیلئے ہر وقت حاضر و مستعد رہتے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کشمیری زبان میں ایک پڑھے لکھے گریجویٹ کے لئے لکھنا باعث ننگ سمجھا جاتا تھا اور لکھنے والے کی کم مائیگی پر محمول ہوتا تھا۔

میں نے حضرت اقبالؒ کے فیضانِ نظر سے علم حیوانات کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کر کے سائنسی تحقیق و تجسس کو کشمیری زبان و ادب کی خدمت پر قربان کر دیا اور اپنے مذکورہ بالا ساتھی کی مدد سے پڑھے لکھے کشمیری ادباء اور شعراء کو یہ احساس دلانے کا

بیڑا اٹھایا کہ آدمی اپنے گہرے خیالات اور جذبات کو اپنی ہی مادری زبان میں بہتر طور
پر ادا کر سکتا ہے۔ یہ تھوڑے ہی عرصے میں کئی مقتدر حضرات کو اپنا ہمنوا بنا سکا جن
میں دینا ناتھ گنجو، بدرالدین بدر، حضرت حیرت پامپوری، پروفیسر پی۔ این پُشپ، عبدالستار
عاصی، دینا ناتھ نادم، قیصر قلندر وغیرہ حضرات شامل تھے۔ جیالعل کلم، مولانا مسعودی،
ڈی۔پی۔ دھر، جو سیاست میں نام پیدا کر چکے تھے، بھی ادب کی دبی ہوئی چنگاریوں
کو جلا دینے کے لئے رونق بزم ہوا کرتے تھے۔ مرحوم عبدالاحد آزاد بھی کبھی کبھی
کشمیر بزم ادب کو اپنی شفقت سے نوازتے تھے مگر ان کو کشمیری شعرائی کی تاریخ
مصروفِ کار رکھتی تھی۔

کشمیری زبان وادب کی خوش قسمتی کے ان ہی دنوں کی بات ہے کہ اتفاق
سے ایک معمر بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے پریم ناتھ پردیسی کے کندھے پر بوجھ ڈالے ہوئے
میرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہی کمرہ کشمیر بزم ادب کا دفتر بھی تھا، میری بیٹھک
بھی اور میری آرام گاہ بھی!

تشریف آور صاحب کی بزرگی شکل وصورت سے ہی نہیں سیرت سے بھی
ظاہر تھی۔ سر پر کشمیری طرز کی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ پھیرن زیب تن تھا اور پاؤں
بھی گھاس کی جوتی اور جرابیں جن پر چمڑے کی مسی (جوتی نما پاپوش) چڑھی
ہوئی تھی۔ پھیرن جس کو "لوچھ" کہا جاتا ہے، اور جس کی لمبی آستینیں ہوا کرتی تھیں
جن سے برہمن لوگ ہر کھانے والی چیز پکڑ کر منہ میں ڈالتے تھے۔
یہ پاکیزہ خو اور خضر صورت ہستی ماسٹر زندہ کول کی تھی۔ میں دروازے تک
استقبال کے لئے آگے بڑھا۔

آداب عرض قبول کرتے ہی گویا ہوئے: "تم ہی عارف ہو؟ دعا ہے کہ کشمیری زبان
کی خدمت کا ذوق جو تم میں موجزن ہے ہمیشہ قائم رہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس زبان کا

یہ خلوص و محبت اور زبان و ادب کے تئیں یہ والہانہ لگن قابلِ رشک تھی۔ اور ایک مجنونِ لیلائے فن کے لئے تاریخی اہمیت کے سنہرے الفاظ تھے۔ اور کوہ کنِ شعر و ادب کے جوئے شیر لانے کی تمنا رکھنے والے کے لئے حوصلہ افزا کلمات تھے۔

آپ ماسٹر جی کے پیارے اور محترم نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ اتنے محبوب استاد گر داسے جاتے تھے کہ ان کے ہزاروں شاگرد یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا اصلی نام زندہ کول تھا۔

آپ کی نجی زندگی سے میں کماحقہ واقف نہیں ہوں۔ یہ اتنی سیدھی اور سادہ تھی، واضح اور صاف تھی کہ اس کے جاننے میں کوئی خاص دشواری بھی نہیں تھی۔ آپ کے عادات سادھارن تھے۔ آپ سچے معنوں میں برہمن صفت پنڈت تھے۔ آپ خدا ترس آدمی تھے۔ راہبوں کی سی زندگی گذارتے تھے۔ اگرچہ گھر میں مقیم تھے اور گرہستی زندگی اپنائی تھی بال بچے تھے۔ اور ایک نوجوان بیٹے کی موت نے زندگی سے دوبھر کر دیا تھا۔ اس کے انجام فنا کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا مگر معتقدوں اور پرستاروں کا ایسا تانتا بندھا رہتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے۔

آپ بڑے نرم گو، نہایت کم گو مگر بڑے خلیق تھے۔ بڑی میٹھی دانائی اور تجربہ کاری سے بھری ہوئی پند و نصائح سے دل موہ لیتے تھے۔ فارسی، انگریزی[1]، اردو اور ہندی کے ماہر تھے۔ اور مؤخر الذکر دو زبانوں میں خاصے اچھے شاعر تھے۔

ہندی زبان میں اپنے کلام کا مجموعہ "پتر پشپ" سنہ ۱۹۴۰ء میں چھپوایا تھا[2]۔ اور اردو

---

[1] ماسٹر جی نے تین جلدوں میں مشہور کشمیری شاعر "پرمانند" کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب میں کشمیری اشعار دیوناگری میں درج ہیں۔ پریم ناتھ بزاز نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب انہوں نے INSIDE KASHMIR لکھی تو اس پر پروفیسر جے۔ ایل۔ کول کے علاوہ ماسٹر جی نے بھی نظر ثانی کی۔

[2] "کاشر سماچار" نے سنہ ۱۹۶۵ء میں ہندی کشمیری (دیوناگری لپی) اور انگریزی میں ماسٹر جی کی یاد میں ایک ضخیم نمبر شائع کیا تھا۔ اس میں "پتر پشپ" کو بھی شامل اشاعت کیا گیا تھا۔ (ایڈیٹر)

کا دیوان انکی وفات کے بعد سنہ ۱۹۶۶ء میں دیوانِ ثابت کے نام سے چھپوایا گیا۔

آپ نام و نمود کے قائل نہیں تھے۔ زمانہ بھی آپ سے ناموافقت دکھاتا رہا۔ بچپن ہی میں افلاس نے روزی کمانے کی تلاش میں سرگرداں کر دیا تھا اور بہ قول نور محمد روشن پہلی ملازمت تین روپے ماہوار پر اختیار کی تھی اور تیرہ سال کی ہی عمر میں سکول چھوڑنا پڑا تھا۔ اُن دنوں ماسٹر جی ایک فوٹوگرافر کے شاگرد بنے۔ اس کے بعد مشن ہائی سکول میں ملازم ہو گئے جہاں سے انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ ہندو ہائی سکول کی ملازمت بقول پروفیسر کے۔ این۔ رینہ سنہ ۱۹۰۳ء میں اختیار کی۔ اور وہاں سنہ ۱۹۲۲ء تک پڑھاتے رہے اس دوران آپ نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ آثار قدیمہ (آرکیالوجی) محکمہ میں بحیثیت اسسٹنٹ آرکیالوجیکل آفیسر مقرر ہو گئے۔ اس محکمہ میں آپ نے تحقیق و تجسّس کا شاندار کام کیا۔ محکمہ نشر و اشاعت میں بھی آپ نے کئی برس ملازمت کی

اردو دیوان سنہ ۱۹۶۹ء میں "دیوانِ ثابت" کے نام سے شری ارجن ناتھ رینہ نے کلچرل اکیڈیمی کی مالی امداد سے شائع کیا۔ دیوان کا آغاز دعا سے کیا گیا ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہر ذرّۂ امکاں میں ہے جلوہ ترا اے لامکاں
ظاہر ہے تو، باطن ہے تو، دونوں جہاں کے جسم و جاں
تجھ سے ازل کی ابتدا، تجھ میں ابد کی انتہا
موجود ہے تجھ سے عیاں، معدوم پھر تجھ میں نہاں
اجسام کی ترکیب میں، ذرات کی ترتیب میں
حکمت ہے تیری ہر جگہ، قانونِ قدرت میں عیاں
توفیق دے یارب کہ ہم سب راہِ معنی پر چلیں
مندر تری پوجا کا ہو، پھر کشورِ ہندوستاں

ثابت کا یہ دیوان ۱۱۶ صفحات ($\frac{20 \times 30}{16}$ سائز) پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۷ عنوانات کے تحت نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ان کا کچھ فارسی کلام بھی شامل ہے۔ ماسٹر جی کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے فارسی کلام کا بیشتر حصہ تلف کر دیا تھا ——— (ایڈیٹر)

اور بوڑھاپے میں وسنتا گرلز سکول میں دوبارہ درس و تدریس میں مصروف رہے ۔

پروفیسر ٹی این رینہ "انتھالوجی آف ماڈرن کشمیری ورسس" میں رقمطراز ہیں کہ ماسٹر جی نے کشمیری شاعری کی طرف پچاس برس کی عمر میں یعنی ۱۹۴۲ء کے بعد لکھنا شروع کیا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب کشمیر بزم ادب علماء و ادبا کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لئے تحریک چلا رہی تھی کہ وہ کشمیری زبان کو اپنائیں اور اسی کو ذریعہ اظہار بنائیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ماسٹر جی نے بھی اس آواز کے ساتھ آواز ملا کر آنے والے وقت کی نبض شناسی کا ثبوت دیا ۔

آپکی مشہور کشمیری تصنیف "سُمرن" ۱۹۵۵ء میں لالہ رُخ مطبوعات کے اہتمام سے انگریزی ترجمے کے ساتھ زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ۔ "آفتابُس ژونگ ہاوُن" کے عنوان سے اس میں نور محمد روشن نے جذبات سے بھرا ہوا ایک مختصر تعارفی خاکہ لکھا ہوا ہے ۔ یہ وہی کتاب ہے جس کو کشمیری زبان میں پہلے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازے جانے کا فخر حاصل ہوگیا ۔ اور ماسٹر جی کو پانچ ہزار روپے اور ایک تامرپتر عطا ہوا ۔

ماسٹر جی کا یہ مجموعۂ کلام فقط ۴۳ ادب پاروں پر مشتمل ہے۔ جن میں نظمیں، غزلیں، رباعیات، ایک نامکمل خمسہ اور ایک قطعہ درج ہیں[1] ۔

بخشی غلام محمد ان دنوں کشمیر کے وزیر اعظم تھے ۔ ماسٹر جی کو اپنا استاد و مرشد مانتے تھے ۔ ان کے سامنے ماتھا ٹیکنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے ۔ استاد اور شاگرد میں انتہائی خلوص و احترام کا تعلق تھا ۔ حالانکہ شاگرد رشید ان سے دسویں جماعت تک بھی پڑھنے نہ پائے تھے ۔ لیکن استاد کی آشیرواد سے بلند ترین مقام پر فائز ہو گئے تھے ۔ ماسٹر جی بھی اپنے شاگرد ذی شان کے مدح خوان تھے ۔ اپنی اسی تصنیف "سمرن"

---

[1] "سُمرن" نستعلیق کے علاوہ جواب دستیاب نہیں، دیوناگری رسم الخط میں بھی چھپ چکی ہے ۔ (ایڈیٹر)

یمِن بخشی صاحب کے متعلق یوں گویا ہوئے ہیں:-

سلامت بھوٗن بخشیس بوٗذ خدا　　شہ ملکس تہ خلقس تیٚہاں جان جان
دعا میون کیا! تَس چھِ نیت دعا　　دوان نیک تیٚ پھل تہ لوٗنان جہان
"چو حاکم بہ فرمان داوَر بود　　خدایش نگہبان و یاوَر بُوَد"
(سعدی رح)

بخشی غلام محمد سے ماسٹرجی کے مراسم ان کی زندگی کے آخری ایام تک قائم رہے۔ ہر عید پر آپ کی سرکاری رہائش گاہ پر ایک نیا قصیدہ تیار کر کے خود پڑھ کر سناتے تھے اور بخشی صاحب انہیں انعام واکرام سے نوازتے تھے،

ماسٹرجی پہلے ایسے مقتدر شاعر تھے جن کو سرکار کی جانب سے دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا تھا اور حضرت مہجور دوسرے ممتاز شاعر جن کو ایک سو روپے ماہوار ملا کرتا تھا۔

یہاں پر اس امر کا انکشاف ادبی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ماسٹرجی کی مذکورہ کتاب 'سُمرن' بلا ترجمہ کئی برس پہلے چھپ چکی تھی۔ اور اتفاق سے یا بالارادہ عین اسی دور میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ دوسری بار چھپوائی گئی جب ساہتیہ اکیڈیمی دہلی خصوصی اہمیت کی کتابوں کیلئے ایوارڈ دینے لگی تھی۔ شرط یہ تھی کہ ایسی مستحق ایوارڈ کتاب پہلی بار شائع ہوئی ہو۔ اور تین سال سے زیادہ عرصہ چھاپ ہونے کے بعد نہ گزرا ہو۔ انعام کے لئے اس کتاب کا انتخاب کیسے ہوا اس کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیلات یہاں پر بیان کرنا نامناسب نہیں ہوگا۔ راقم ان دنوں ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے کشمیری زبان کے ایڈوائزری بورڈ (مشاورتی کمیٹی) کا چیئرمین تھا اور جنرل باڈی کا رکن بھی۔ اس لئے مجھے بھی ایوارڈ کی مستحق کتاب کے متعلق رائے دینے کا حق تھا۔ میں نے اس بات کو واضح طور پر لکھ دیا کہ یہ کتاب (سمرن) چونکہ عرصہ پہلے چھپ چکی ہے اس لئے اس کو ایوارڈ کیلئے چُنا نہیں جا سکتا۔ لیکن جب آل انڈیا ریڈیو سے سُمرن کے لئے بھی انعام دئے جانے

کا اعلان کیا گیا تو راقم کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ راقم نے سوچا — یہ اتنا بڑا فراڈ — !
اور نہرو جی کی صدارت میں — یقین نہیں آیا کہ نہرو جی کے سامنے واقعات کو درست
طور پر رکھدیا گیا ہوگا۔ لیکن سیاسی رہنماؤں کا مسلک ہی جُداگانہ ہوا کرتا ہے۔ بہر حال
میں نے طیش میں آکر مسٹر کرشنا کرپلانی، سیکرٹری ساہتیہ اکیڈیمی کو ایک پُرزور پروٹسٹ
نوٹ بھیجدیا۔ اور جب میں چند روز کے بعد جنرل باڈی میٹنگ میں شمولیت کیلئے دہلی
گیا اور کرپلانی جی کو اپنی ناراضگی کا تاثر دیا اور ساتھ ہی صدر اکیڈیمی (نہرو جی) سے
اس دھاندلی کی شکایت کرنے کی دھمکی دی تو وہ مسکرائے زبان سے کچھ نہیں کہا۔
میٹنگ شروع ہوئی تو میں کرشنا کرپلانی کی بائیں جانب بیٹھ گیا۔ نہرو جی بھی تشریف
فرما تھے۔ میں شکایت کرنے کے ارادے سے کرسی پر سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ
کرپلانی جی بھانپ گئے۔ میرے کوٹ کا دامن پکڑ کر مجھے بٹھا دیا اور چپکے سے مجھے بخشی
صاحب کی وہ سفارش پڑھنے کو دی جو انہوں نے سُمرن کے منتخب کئے جانے کے
لئے نہرو جی کے ذاتی ایڈریس پر بھیجدی تھی۔
کرپلانی نے ازروئے شفقت مجھ سے کہا: "بھئی! چُپ رہنے میں ہی سلامتی
ہے۔ ورنہ چکی کے دو پاٹوں (دو حاکموں) میں پسے جاؤ گے!
میں اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا۔
ماسٹر جی کی کشمیری نظمیں برجستگی زبان اور خیالات کی گہرائی میں اپنا جواب آپ
ہیں۔ نمونۂ کلام پیش خدمت ہے:

ناکارہ گوٗمُت نگر سوٗن !
بنس نہ لایق روٗدہ مُت
لوٗس تہ ہموٗسس باتھ وُبھ
شنز باگ مسکین موٗدہ مُت

ژٕلہٕ ہاتہٕ بیٚنہٕ یِمہٕ ہاہٕ یوٗر

کرٕناوہٕ تارکھ نا اپوٗر

ظاَلِم زلُہٕ زنٕ زال ہیتھ

زاگان غریبن زوٗرہٕ واٹلی

کھوژن یہٕ حاکِم مارہ ما

ژٕرژھ گاَر ما کتہٕ آسہٕ گاٹلر

چھک ییٚریعو کھٕتے دِیارہٕ زوٗر

کرٕناوہٕ تارکھ نا اپوٗر

مانو بُنیہٕ موہنیو مزدُوٗر

چھوٗن نوٗن بلیُن اُچھ گاشہٕ روٗس

لبرلوکہ ہنٛزے باڑران

زٕلوسہٕ ناوان باشہٕ روٗس

ساران خبر ہندی پاٹھی لوٗر

کرٕناوہٕ تارکھ نا اپوٗرے ۔ ۱

مندرج سطور میں ماسٹر جی زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر غریب مزدور کی حالت زار کا رونا تو رو رہے ہیں لیکن انقلاب کی روح سے اثر پذیر نہیں دکھائی دیتے ہیں۔ ان حالات کے بدل دینے کا علاج آپ کے پاس نہیں ہے۔ آپ ان حالات سے فرار کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ باوجود اس امر کے کہ کشمیر بزم ادب، کلچرل فرنٹ اور کلچر کانگریس جیسی تنظیمیں مزدوری اور سرمایہ داری، غریبی اور آسودہ حالی، مظلوم اور ظالم کی جنگ میں معروف عمل تھیں۔ ماسٹر جی حالات سے تنگ آکر اس طوفانی دریا کو عبور کر کے اس پار پہنچ کر امن و سکون کا سانس لینا چاہتے تھے۔

مندرجہ ذیل نظم کے اسلوب بیان کو ملاحظہ فرمائیے اور روانی اور زورِ بیان کی داد دیجئے :-

نوؤ وری آو گلشنس نوی ورایہ پوش	پوشہ نولو لوٕ کرِن ہنیوت بول بوش
عیلہ منز توشان چھ بادام پوشہ ہنے	دے سراں ستہ زن بہتھ ہیتھ گوشہ ہنے
لوٕ مرن ہُند ہیرہ سنطورا وزان	بوٕ نہ سماوارس ہ ساز س مان مان
یپہ ژوبالیہ اَسی تہ باغس منز سمہ	لوٕ وری چھاوو تہ نوژگ مس چمو
پرانی مشربھ غوصہ نوٕ وینہ رُت کرو	رُت وبڑارہ رُت وُلوٗ تے رُت کرو

ان اشعار میں کس سادگی سے گنے چُنے الفاظ میں بادام واری (باغ) کی دو طرح کی چہل پہل کا خاکہ پیش کیا ہے۔

عام لوگوں کے سماواروں، ساز و سنطور اور محبت و پریم کی محفلوں کا ذکر بھی کیا ہے اور بزرگوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اپنے میں ڈوب کر سراغِ زندگی کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔

ماسٹر جی دورِ حاضر کے وہ پہلے بڑے شاعر ہیں جنہوں نے پرانی بحور و قوافی کے علاوہ نئے طرز کی شاعری کی داغ بیل بھی ڈالی اور نیا اندازِ بیان پیدا کیا:

کوٗرم یہ ٹاٹھ کیا ونس	تھوٗن نہ باقی ماہرہ نس
ستہ رُم چھ منہ تہ اَہنس	یہ کوٗر نہ کاٹہ دشمنس
سوٗرم سہ لالہ رُخ منس	جلاو لوٗگ کرزل ونس

لے آنجہانی پریم ناتھ بزاز نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ماسٹر جی کا کلام کتابی صورت میں آنے سے قبل ان کے اخبار "وتستا" میں اور بعد ازاں "ہمدرد" میں چھپا کرتا تھا۔ (ایڈیٹر)

پھوٚرِم ژٕ نار خرمنس   ؤنگس ہٕ کینہہ تہٕ زیٖچھٕ ڈٕنس
دِلس ہیٚوٚ تٕھ جِگر تیتیوٕ
ژٕ شوٗر وٗنھو ؤنار ہا

افسوس اس بات کا ہے کہ اس قسم کی برجستہ نظم نہ تو "سُمرن" میں ہی مکمل طور پر درج ہے اور نہ پروفیسر جے ایل کول نے اپنی "کشمیری لرکس" (مطبوعہ ۱۹۴۵ء) میں اور نہ ہی پروفیسر ٹی۔ این کول (ریبہ) نے اپنی انتھولوجی ۱۹۳۰ تا ۱۹۶۰ میں پوری طرح شامل کی ہے۔ ماسٹرجی کی اُردو نظموں کا مجموعہ میرے سامنے نہیں ہے۔ تاہم ایک مشہور ترین نظم کا ایک بند بیان کر سکتا ہوں جس کا عنوان کلرکی[1] ہے۔ اس میں بھی ماسٹرجی کی قادر الکلامی، برجستگی اور سادگی نمایاں ہے۔ ایک تلخ ترین واقعے کو کتنی شیریں زبان میں ادا کیا ہے۔ اس نظم میں (آزادی سے پہلے) کلرکوں کی قلیل تنخواہوں کا رونا ہے جب ایک کلرک تیس روپے اور ایک منسٹر تین ہزار ماہانہ لیتا تھا۔

بفضلِ خدا تیس کا گریڈ بھی ہے   ترقی کی اُمید کا شیڈ بھی[2] ہے
تفاوت منسٹر سے ہے دو صفر کی   اوہو ہو کلرکی اہا ہا کلرکی !

"تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را   گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"

[1] عارف صاحب نے جس نظم "کلرکی" کا ذکر کیا ہے وہ "دیوانِ ثابت" مرتبہ ارجن ناتھ ریبہ (۱۹۶۶ء) میں "کلرک محرر کی زبانی" کے عنوان سے درج ہے۔ جو اشعار بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں وہ اس دیوان میں یوں درج ہیں۔ یاد رہے کہ یہ نظم "نوروہہ" کے موقعہ پر ماسٹرجی نے جموں میں ایک تقریب پر پہلی بار سنائی بھی اور اسے بے حد سراہا گیا تھا۔

یہ کیا کم ہے ان پیڈ سے پیڈ بھی ہے   بفضل خدا تیس کا گریڈ بھی ہے
ترقی کی امید اک شیڈ بھی ہے   منسٹر سے کیا ہے کمی دو صفر کی
اہو ہو کلرکی ! اہا ہا کلرکی !

میرے خیال میں اس نظم کے کچھ اور بند یہاں پر نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا تاکہ پوری نظم کا کچھ کچھ

حفظ اٹھایا جاسکے ۔ (ایڈیٹر)

ہمیں کچھ ضرورت نہیں مال و زر کی — ہمیں کوئی خواہش نہیں کر و فر کی
دعا ہے ہماری یہ شام و سحر کی — ہمیں یا الٰہی عطا کر کلرکی !

اہو ہو کلرکی — اہا ہا کلرکی !

نہ سمجھو ہے بیکس بیچاری کلرکی — کلرکی سے ہم ہیں، ہماری کلرکی
نہ چھوڑیں گے ہم اپنی پیاری کلرکی — اگر اس میں دنیا ادھر ہو ادھر کی

اہو ہو کلرکی — اہا ہا کلرکی !

سنو فائدے ۔ نمبر اول قناعت — دوم یاد مرگ ۔ اور سوم ترک لذت
چہارم عبادت تو پنجم ہے محنت — غرض خوبیاں ہیں گلستان بھر کی

اہو ہو کلرکی — اہا ہا کلرکی !

گلستان سعدی کو سب جانتے ہیں — نصیحت میں سب شیخ کو مانتے ہیں
قناعت کو دولت وہ گردانتے ہیں — یہی ہے جو دولت تو باندی ہے گھر کی

اہو ہو کلرکی — اہا ہا کلرکی !

کفایت کرے جیسے سالک کو گیتا — شکاری کو نوفٹ کا بنگالی چیتا
محرر کو دو چار گز سرخ فیتہ — کمائی ہے کافی یہی عمر بھر کی

اہو ہو کلرکی — اہا ہا کلرکی !

ریڈکشن کی جو گفتگو سو بہ سو ہے — یہی تیغ ڈاما کلس ہو بہو ہے
کہ اوپر لٹکتی بہ یک تار مو ہے — مثل ٹھیک ہے بھیڑ کی بیر بٹھ کی

اہو ہو کلرکی — اہا ہا کلرکی !

DEMOCLES SWORD *

* کشمیری میں ایک مشہور تلمیح ہے "بیر بلُن کھٹ گژھن" ۔ کہتے ہیں کہ اکبر اعظم کے ظریف وزیر پنڈت بیربل ایک بھیڑ کو خوب کھلاتے تھے مگر پاس ہی ایک چیتا پنجرے میں رکھ چھوڑتے تھے تا کہ بھیڑ کھا کر موٹا نہ ہونے پائے ۔

نہیں، دودھ مکھن کی، میوہ کی عادت — لڑکپن سے تھی ایسی عشرت سے نفرت
ہمارے لئے ہے یہ اصلی ضیافت — کھٹوری جو مل جائے آٹو مٹر کی
اہو ہو کلرکی — اہاہا کلرکی

سدا "ست بچن جی" "حضور" اور "بہتر" — سدا "یس سر"[1] اور سدا "ویری ویل سر"[2]
جھکا سر ہو آنکھیں ہوں فرش زمیں پر — اطاعت خدا سے زیادہ بشر کی
اہو ہو کلرکی — اہاہا کلرکی

وہ خرگوش کی چال دفتر کو جانا — وہاں شام تک کام میں جی لگانا
اندھیرے میں کچھوے کی مانند آنا — بغل میں لئے ٹوکری ایریر[3] کی
اہو ہو کلرکی — اہاہا کلرکی

لگا ہے مجھے بسکہ دفتر کا دھندا — زیادہ نہیں فرصت نہ ہر خندہ
لہذا یہیں ختم کرتا ہے بندہ — مرے دوستو داد دو مختصر کی
اہو ہو کلرکی — اہاہا کلرکی

---
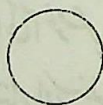
۱ Yes Sir
۲ Very Well Sir
۳ Arrear

غلام علی مجبور

استاد کمال بٹ

ارضِ کشمیر نے زندگی کے حسین امتزاج کو ایک ایسا رنگ و روپ بخشا ہے جو انسان
کو زندگی کی تمام تلخیاں بھلاتے بھلاتے رسیلے سنگیت کی دھنوں پر لیون کی لوری سناتے
وادیٔ گل پوش کی چہکتی بلبلوں سے آشنا کرانے کے لئے جب اپنا ہاتھ بڑھاتا
ہے تو انسان سنگیت کی دنیا کے اس سنگم پر پہنچ جاتا ہے جہاں سازوں کے بادشاہ
سنتور کی دھنیں اسے پُر سکون دنیا کی آغوشِ راحت میں پہنچا دیتی ہیں۔ یہ وہ دنیا
ہے جہاں سازِ کشمیر کے ساتھ ساتھ ستار اور سنتور بھی ڈھولک کی تال پر صوفیانہ موسیقی
کے تابندہ اور مدھر مقام (راگ) اُبلتے ہوئے شیریں چشموں کی طرح پھوٹتے ہیں۔

زندگی کو سکون بخشنے کے لئے جہاں قدرت نے ارضِ کشمیر کو بے پناہ حسن سے
نوازا ہے وہاں سنگیت کی دنیا میں بھی عظیم ہستیوں کو جنم دیا۔ کشمیر کے مشہور گاؤں
واہتھورہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں چند اچھے گلوکاروں اور موسیقاروں کا جنم ہوا۔
یہاں کشمیری موسیقی، شاعری، لوک ناچ اور لوک ناٹک کو نئی جہتیں عطا کرنے والے
فن کار، شعراء، رقاص اور اداکار بھی پیدا ہوئے ہیں۔ صوفیانہ موسیقی کے معروف موسیقار

استاد کمال بٹ
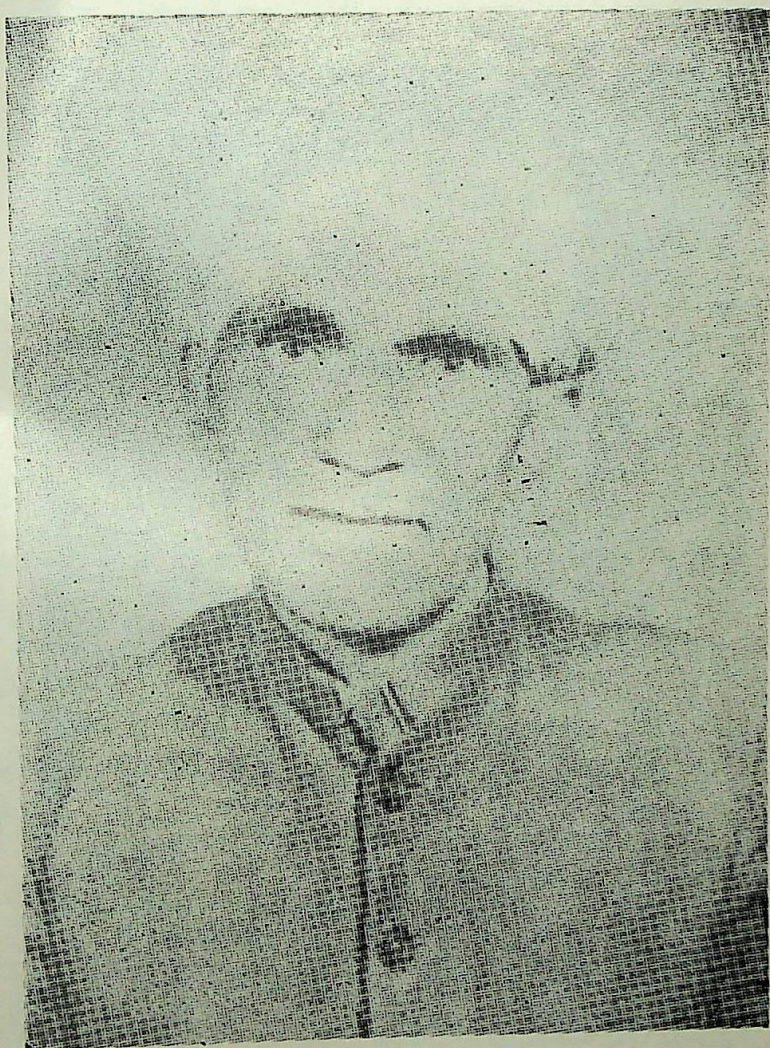
عبدالقدوس رسا جاودانی ـــــــ (۱۹۰۱ء ـــــ ۱۹۷۹ء)

گلوکار اور رقاص استاد کمال بٹ مرحوم بھی واہقورہ کے ایک بھانڈ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا شجرہ نسب یوں ہے:۔
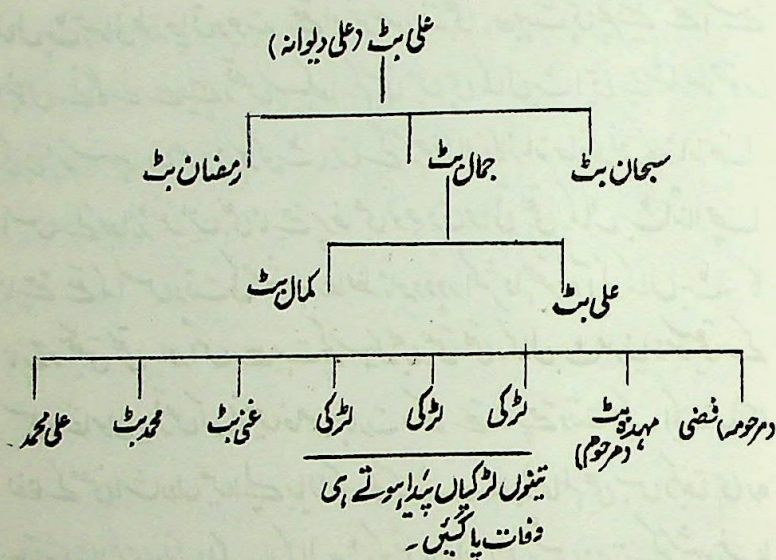
استاد کمال بٹ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی مستند قابل قبول تحریر موجود نہیں ہے۔ واہقورہ کے چند عمر رسیدہ بزرگوں کے بیان کے مطابق کمال بٹ کا جنم ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان ہوا ہے۔ انکی بیوہ مسماۃ زیبہ بھی اس بیان سے متفق ہے۔ حالانکہ ریڈیو کشمیر سرینگر میں مرحوم کے سروس بک (SERVICE BOOK) کے مطابق ان کا تاریخ پیدائش ۱۰ ستمبر ۱۹۱۲ء ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔ اس فرضی تاریخ پیدائش کی بنیاد ایک غلطی بیان ہے۔ چنانچہ مرحوم خود بھی اس تاریخ پیدائش کو غلط مانتے تھے اور وفات سے قبل اپنی عمر سو سال کے قریب بتاتے تھے۔

استاد کمال بٹ کے والد جمال بٹ ایک جانے مانے بھانڈ تھے صوفیانہ موسیقی میں زیادہ ماہر نہ تھے البتہ ڈھول بجانے میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ کمال بٹ نے گانے بجانے اور رقص کی ابتدائی تربیت اپنے والد سے ہی پائی جب جمال بٹ نے

رقص و رامش میں اپنے بیٹے کی دلچسپی اور لگن دیکھی اور ساتھ ہی اس کی آواز میں مٹھاس پایا۔ تو واہتھورہ کے بڑے بھانڈ استادوں کو اپنے لڑکے کی تربیت کیلئے راضی کیا۔ کمال بٹ جسمانی طور چاق و چوبند تھے اور خوبصورت بھی۔ وہ بہت ہی پھرتیلے تھے اسلئے انہوں نے گانے سے پہلے رقص سیکھا۔ کم سنی میں ہی کمال بٹ اپنی بے شمار صلاحیتوں کی بنا پر مشہور رقاص (بچہ کوٹ) بن گئے۔ چونکہ ان کا زمانہ حافظ نغمہ کا زمانہ تھا اس لئے بھانڈ نغمہ میں بھی ناچنے پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ کمال بٹ اتنا اچھا ناچتے تھے کہ اس وقت کی مشہور حافظہ تاجہ دور اکثر واہتھورہ آکر کمال بٹ کا ناچ دیکھتی تھی، اور اس سے بہت کچھ سیکھ بھی لیتی تھی۔ کمال بٹ صوفیانہ موسیقی کے سبھی مقاموں پر رقص کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ ناچتے وقت ایک ایک فارسی لفظ کے معنی اشاروں میں ایسے بیان کرتے کہ بڑے سے بڑا عالم بھی بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ ان ہی دنوں ایک بار کمال بٹ کوئیل (ٹرال) میں اُس وقت کے مشہور غلا دوست صوفی وہاب کرال کے سامنے محو رقص تھے۔ محفل صوفیانہ موسیقی شباب پر تھی، ایسے میں وہاب کرال وجد میں آکر اٹھ کھڑے ہوئے اور ناچتے ہوئے کمال بٹ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر زمین پر پٹک دیا اور فرمایا: "اُمس ہٹہرس کوٹہ منیہ چھو کھ" (اس سالے کو میں نے دھو ڈالا)۔ یہ بات سو فیصدی درست بھی ہے۔ واقعی کمال بٹ کا فن ہر طرح سے پاکیزہ اور بے مثال تھا۔ آواز میں درد، مٹھاس اور ناچ میں فن کارانہ لچک — جو شاید ہی کسی دوسرے فن کار میں ہو۔ ایام جوانی تک ناچتے بھی تھے اور گاتے بھی تھے۔ بھانڈ جشن میں بھی ناچتے تھے۔ کئی بار "بُہر" اور "ماگُن" کی قابل تعریف اداکاری بھی کی۔ ڈھول بھی بہت ہی اچھا بجاتے تھے۔ انکی عمر ۲۰ سال تھی جب آپکی شادی بلہ پورہ (شوپیان) میں طے پائی اور اس کے فوراً بعد انہوں نے ناچنا ترک کردیا اور صرف گانے کی طرف توجہ دیتے رہے۔ گانے سے چونکہ بیحد دلچسپی

تھی اس لئے یکسوئی کا فائدہ یہ ہوا کہ اُن کا فن دن بہ دن نکھرتا چلا گیا۔ اگرچہ وہ گاتے وقت خود ہی ستار بجاتے تھے لیکن طبلہ بھی اچھی طرح بجا سکتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد گھر گرہستی کی الجھنوں نے کچھ مدت کے لئے انہیں بہت ہی پریشان کر دیا۔ لیکن انہوں نے صبر و سکون کا دامن تھاما اور مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ کیا۔ موسیقی کے بہت سے پرستار ہر روز اُن کے گھر آ کر گھنٹوں موسیقی سنتے۔ اس طرح کمال بٹ کا سارا وقت اِن بِن بلائے مہمانوں کی خدمتگاری میں صرف ہو جاتا تھا اور وہ تنگدست ہو جاتے تھے۔ لعل گام کے ایک پنڈت جی جیا لال گھوڑے پر سوار ہر روز کمال بٹ سے ستار سیکھنے آتے تھے۔ ایک اور پنڈت جی لیشہ بٹ، جو کہ وانقورہ ہی کے رہنے والے تھے، ہر روز (یہاں تک کہ اس زمانے میں انہوں نے کمال بٹ کی بارات میں شرکت کی اور شوپیان گئے) کمال بٹ کے گھر آتے تھے غرض بڑے بڑے حکام، جاگیردار، سرکاری اہلکار اور صوفی و درویش کمال بٹ کے گلے کے دیوانے تھے۔ پٹن کے درویش سکندر صاحب، احمد صاحب تیلی، تولہ مولہ کے اکرم صاحب صفا پورہ کے سخی صاحب جیسے دوستان خدا بھی ان کا گانا سنتے تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے کمال بٹ راولپنڈی، لاہور، پشاور، سیالکوٹ، امرتسر، انبالہ، دہلی اور جموں میں اپنی پارٹی کے ساتھ گاتے ہوئے لوگوں کو اپنے کمالِ فن سے متاثر کر چکے تھے۔

آزادی کے بعد جب جاگیرداروں سے عہدے اور زمینیں چھن گئیں تو کشمیر کے باقی فن کاروں کی طرح کمال بٹ بھی بہت تنگدست ہو گئے۔ پانچ چھ سال تو بہت ہی پریشان حال رہے اور باقی بھانڈوں کی طرح گھر گھر جا کر بہت ہی قلیل رقومات پر گاتے۔ اکثر گاتے ہوئے ان کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے تھے۔ ایسے ہی میں ایک دن درسو (اونتی پورہ) کے ایک کھلیان میں ایک گنوار کسان نے غصے میں آ کر کمال بٹ پر ایک پولا دے مارا۔ کمال بٹ اس بے عزتی پر روتے ہوئے اور

آنسو بہاتے ہوئے واپس گھر آگئے اور اُسی دن سے گھر گھر جاکر گانا بند کر دیا۔ جب کوئی چاہنے والا یا موسیقی کا دلدادہ گھر بلاتا تو خوشی خوشی جاتے۔

۱۹۵۰ء کے شروع میں ایک دن کشمیر کے اس وقت کے وزیر اعظم مرحوم بخشی غلام محمد نے کمال بٹ کو بُلا بھیجا اور رات بھر ان کا گانا سُننے کے بعد ان کو ریڈیو کشمیر سرینگر میں بحیثیت سٹاف آرٹسٹ بھرتی کرایا۔ ملازمت کے دوران کمال بٹ نے بہت ہی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ وقت کے بڑے پابند تھے ہمیشہ وقت سے پہلے ہی ڈیوٹی پر آتے تھے۔ عام طور پر ستار بجاتے تھے۔ ستار بجانے میں آج تک کوئی بھی ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکا۔ ضرورت کے وقت طبلہ بھی بجاتے تھے۔ سُر اور تال کے استاد تھے۔ صوفیانہ موسیقی کے علاوہ لل ایشوری اور نُند ریشی کا کلام بھی اپنے مخصوص اور سُریلی آواز میں گاتے تھے۔ دورانِ ملازمت کئی بار دہلی۔ رانچی اور کئی دوسرے مقامات پر بھی اپنے فن کا جادو جگایا اور لوگوں سے داد و تحسین حاصل کیا۔ تحت قوانین آپ کو ۱۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہونا تھا لیکن اچھے کام اور ماہرانہ صلاحیتوں کی بناء پر آپ کی سبکدوشی دو سال بعد یعنی ۱۷ ستمبر ۱۹۷۳ء عمل میں آئی۔

ریاست کی کلچرل اکیڈیمی نے کشمیر کی کلاسیکل موسیقی (صوفیانہ موسیقی) کے احیائے نو اور اسے لوگوں میں مقبول بنانے کے لئے ٹیگور ہال میں صوفیانہ موسیقی سکھانے کے لئے ایک تربیتی کلاس شروع کی جس میں بحیثیت اساتذہ غلام محمد قالین باف کے علاوہ استاد کمال بٹ کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ یہ کلاس چند سال تک چلی۔ تربیت پانے والے طلباء اور طالبات کو دورانِ تربیت ماہانہ ڈیڑھ سو روپے بطور وظیفہ بھی دیا جاتا تھا لیکن پھر بھی بہت کم طلباء اس فن کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے بعد حوصلہ افزا افضانہ پانے کی بناء پر اکیڈیمی کو مجبوراً یہ کلاس بند کرنا پڑی۔ بہر حال استاد کمال بٹ اپنی وفات تک

اس تربیت گاہ سے وابستہ رہے۔

استاد کمال بٹ آج زندہ نہیں لیکن اُن کا فن آج بھی زندہ ہے۔ اُن کے شاگرد ان کے فن کی لازوال امانت اپنے پاس محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں خواجہ عبدالغنی نمتہ ہالی، محمد خلیل، سُلہ بٹ، علی بٹ، مہدو بٹ شہنائی نواز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

استاد کمال بٹ بڑے ہی زندہ دل اور ہنس مکھ تھے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک بزرگانہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ سفید پوشاک اور سفید پگڑی پہنتے تھے۔ بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک بار ایک شاگرد نے ان سے پوچھا: "آپ کو کون سا مقام زیادہ پسند ہے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "سبھی مقام میرے جسم کے حصے ہیں۔ اب کیا بتاؤں کہ کون سا پسند ہے اور کون سا ناپسند"۔

استاد کمال بٹ کے بڑے صاحبزادے مہدو بٹ بھی ستار بجاتے تھے اور ریڈیو میں عارضی طور پر گاتے تھے لیکن ان کا کم عمری میں ہی انتقال ہو گیا۔ ان کے تین بیٹے حیات ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ تو کوئی ساز بجاتا ہے اور نہ ہی انہیں موسیقی سے دلچسپی ہے۔ کمال بٹ کی بیوہ سماۃ زیبہ بھی ابھی بقید حیات ہے لیکن عمر رسیدہ ہونے کی وجہ قوت سماعت سے محروم ہے۔ اس کی بینائی بھی کمزور ہو گئی ہے۔

کمال بٹ صرف دو دن کی علالت کے بعد جمعرات ۲۹، ذی القعدہ ۱۳۹۸ھ، مطابق ۲، نومبر ۱۹۷۸ء کو ۴ بجے صبح سری نگر کے صدر ہسپتال میں رحلت کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو سکون بخشے۔ واہتھورہ میں صوفیانہ موسیقی کے اس آخری چراغ کے گُل ہونے پر ہر سال ۲، نومبر کو ریاستی کلچرل اکادمی کے تعاون سے یوم کمال بٹ منایا جاتا ہے۔ اُن کی ہی یاد میں واہتھورہ میں ایک ادارہ نیشنل بھانڈ تھیٹر بھی بنایا گیا ہے۔ کمال بٹ واہتھورہ میں ہی اپنے آبائی قبرستان حضرت بابی شاہ

صاحب کی زیارت گاہ کی بائیں طرف دفن ہیں۔ آپ کی تربت پر یہ تحریر آج بھی نمایاں ہے:

گذشتہ عمر من افسوس افسوس	زدہ منزل وطن افسوس افسوس
چہ می خواہی درایں دنیائے فانی	بغیر از یک کفن افسوس افسوس
نمی دانم کہ فردا خاک در خاک	شود شاہ و گدا افسوس افسوس

(مقام کلیان۔ تال چیندانا)

سیّد رسول پونپر

مس میلنسن

کوئی بھی بیرونی قوم اس وقت تک کسی ملک کی سرزمین پر اپنے قدم مضبوطی سے نہیں جما سکتی جب تک کہ وہ وہاں کی آبادی کے ثقافتی اور تمدّنی باطن کے تقاضوں کو نہ سمجھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی تہذیب کے گوناگوں پہلوؤں کو جاننے اور ان کی تہہ تک جانے کی سنجیدہ کوشش کیں۔ چنانچہ تحقیق و تدوین اور ترجموں کا کام ہاتھ میں لیا گیا۔ فلاکت زدہ، پسماندہ اور توہم پرست عوام کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مشنری سکول (Missionary School) قائم کئے گئے، جیسا کہ ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے "جدید و قدیم" کی آپس میں ٹھن جاتی ہے۔ چنانچہ عیسائی مشنریوں کو بھی یہاں کشمیر میں کٹھ ملاؤں اور کٹر پنتھیوں

کی لازمی اور شدید مخالفت و مخاصمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تاریخ کے پہیوں کو پیچھے کی طرف موڑنا چاہتے تھے۔ لیکن کامیاب کہاں ہوتے۔ رفتہ رفتہ اُن کا زور و اثر کم ہوتا گیا اور یہاں عیسائی مشینریوں کے ہاتھوں جدید تعلیمی اداروں کی بنیاد پڑی۔ آج کا میلنسن سکول بھی انہی مؤقر اداروں میں سے ایک ہے اوّلین سی۔ ایم۔ ایس سکول کی بنیاد جے۔ ایچ۔ نولز (J. H. Knowles) کے مبارک ہاتھوں سرینگر میں ۱۸۸۰ء میں حکومتِ وقت کی ممانعت کے باوجود پڑی۔ قانون کی زد سے بچنے کے لئے مشنری ہسپتال سرینگر کے احاطے میں انتہائی نازک حالات میں سکول کا کام جاری رکھا گیا اور پھر ۱۸۹۰ء میں حکومت کی طرف سے پابندی اُٹھائے جانے کے بعد دریائے جہلم کے کنارے فتح کدل کی ایک نادر طرز کی بڑی عمارت میں اسے منتقل کیا گیا، جس کی باقیات آج بھی یادگار زمانہ ہیں۔[۱]

عیسائی مشنریوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کئے بغیر سماجی زندگی میں تبدیلی کے امکانات تاریک ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس امر کی طرف بھی توجہ کی مِس جے۔ جی۔ ٹیلر، مِس سٹبنس، مِس گوڈال،

۱؎ نئے فتح کدل (برج) کی تعمیر کے ساتھ ہی اس سکول کی پوری عمارت کو نیلام کر دیا گیا اور بعد ازاں ٹھیکیدار صاحبان نے اینٹیں، پتھر اور لکڑی کے حصول کے لئے اسے گرانا شروع کیا۔ اس طرح سکول کی بنیادیں تک کھودی گئیں اور آج اس جگہ ایک ویران سے قطعۂ زمین کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ۔ (ایڈیٹر)

اور مس فٹ زے (Miss churchil Taylor, Miss
Stubbs, Miss Goodal and Miss Fitze)
کا شمار اُن ممتاز خواتین مشنریوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر میں تعلیم نسواں
کو مقبول بنانے میں نُمایاں اور کلیدی رول ادا کیا۔

مس میلینسن کی عملی دلچسپی کی وجہ سے سی۔ ایم۔ ایس سکول سنہ ۱۹۲۲-۶۲ء
کے دوران انقلاب آفرین تبدیلیوں سے ہمکنار رہا، جب وہ اس کے صدر مدرس
(Principal) کی حیثیت سے اپنے فرائض مستحسن طریقہ سے انجام دیتی رہیں[1]

---

[1] یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا کہ گرلز سکول بھی بائز سکول کے
ہی قریب محلہ ملک یار میں برلب جہلم ایک وسیع قطعۂ زمین پر تعمیر کیا گیا تھا
جسے ایک زمانہ میں "چک باغ" اور "ملک باغ" بھی کہا جاتا تھا۔ سکول کی تعمیر
کے وقت اس قطعۂ زمین کے مالکانہ حقوق صاحبزادہ خاندان کو حاصل تھے۔ مالکان
زمین سے طے پایا تھا کہ سکول کی منتقلی کی صورت میں سکول کی عمارت کے ملکیتی
حقوق بھی انہیں ہی حاصل ہوں گے۔ چنانچہ سکول کی عمارت ایل شیپ "L"
(Shape) میں بنائی گئی ہے۔ اس کے صحن میں ایک اچھا خاصا تالاب بھی تھا
کافی عرصہ گزرنے کے بعد مالکان زمین نے کرائے میں اضافے کی مانگ کی چنانچہ معاملہ
کورٹ کچہری تک جا پہنچا۔ ادھر سکول کے منتظمین کو لگا کہ اب طالبات کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے،
اور سکول کی عمارت میں حسب منشاء توسیع کی گنجائش بھی نہیں تو مذکورہ سکول
کو بسکو سکول کے پاس ہی شیخ باغ منتقل کیا گیا۔ اور سکول کی عمارت مالکان زمین کو
بعوض پانچ ہزار روپے دے دی گئی۔
مذکورہ سکول عمارت تا دم تحریر اسی حالت میں موجود ہے سوائے
عمارت کے ایک حصے کے جو برلب دریا واقع تھی اور (باقی اگلے صفحہ پر)

کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ مِس میلنسن نے بجا طور پر کشمیری عورتوں کے تعلیمی اور تہذیبی اِرتقاء کے لئے اہم رول ادا کیا۔ اُس کی ذات کے بغیر یہ دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ اُس کی مؤثر اور متحرک رہنمائی میں یہ مؤقر ادارہ ثقافتی اور تمدّنی سرگرمیوں کا محور و مرکز رہا۔ اُس نے تعلیمی نصاب میں تیراکی، رقص، کسرت، گُل گشت، کوہ پیمائی وغیرہ جیسی مہم بازیوں کو شامل کردیا کسی گُل گشت کے دوران لڑکیوں کا کہیں گھر سے باہر قیام پر آزادی سے اِدھر اُدھر گھومنے کا منظر نہایت ہی مسرت آمیز اور فرحت افزاء ہوتا تھا۔ اس طرح کوہ پیمائی کی پہلی مہم کا اہتمام ۱۹۳۸ء میں ہوا جب ۴۰ (چالیس) کے قریب طالبات نے مہادیو کوہ پیمائی مہم میں شامل ہونے کے لئے تحریری اجازت مانگی۔ گرل گائیڈ تحریک نے لڑکیوں کے ایک دوسرے کی خاطر جینے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی طرف نہ صرف راغب کیا بلکہ ان میں ایسا کرنے سے احساس ذمہ داری، عزتِ نفس اور ضبطِ نفس کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔

انگریزی، اُردو، فارسی، ریاضی، معلوماتِ عامہ اور مطالعۂ فطرت جیسے مضامین شامل نصاب تھے۔ ۱۹۴۴ء میں ہندی کی پڑھائی بھی شروع ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں سائینس کی تعلیم کو رائج کیا گیا جبکہ طالبات کے کسی اور سکول میں یہ مضمون نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ کپڑے دھونے، کھانا پکانے،

(پچھلے صفحہ کے فٹ نوٹ کا بقیہ) خستہ حالت میں تھی چنانچہ موجودہ مالکان (صاحبزادہ صاحبان) نے اسے گرادیا اور اسکی جگہ آجکل ایک سہ منزلہ عمارت وجود میں آچکی ہے اس طرح تالاب کو بھی بھر دیا گیا ہے۔ — (ایڈیٹر)

کے ساتھ ساتھ ٹوکریاں بنانے اور سوزن کاری و دیگر دستکاریوں کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی۔

یہ سب انقلابی تعلیمی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے دوررس اقدام بے انتہا دقتوں کا سامنا کرنے کے بعد ہی ممکن ہوئے۔ ایک طرف سے عوام کی جہالت، توہم پرستی کا مقابلہ جاری تھا تو دوسری جانب ڈوگرہ حکومت کی عدم توجہی سب سے بڑی رُکاوٹ بنی تھی کیونکہ علم کی روشنی سے عوام کی سیاسی بیداری کی شروعات ہوتیں جو ہر حکمران طبقہ کے لئے ہر دور میں سب سے بڑا خطرہ تصوّر ہوتی آئی ہے۔ اس لحاظ سے مس میلنسن کا کام تعلیم نسواں کے میدان میں بالخصوص تاریخ ساز بھی تھا اور انقلاب آفرین بھی۔ ان خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شیرِ کشمیر شیخ محمد عبد اللہ مس میلنسن کے تئیں خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے بجا طور پر یوں رقمطراز ہیں :

" مس میلنسن کی حیثیت ریاستِ جموں و کشمیر میں تعلیم نسواں کے میدان میں ایک پیشرو کی ہے۔ اُس نے اکتوبر ۱۹۲۲ء سے نومبر ۱۹۶۲ء تقریباً چالیس سال تک کشمیر میں قیام کیا۔ اس عرصہ کے دوران اُس نے کشمیریوں سے والہانہ محبت کی اور اُن کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کیا جس کے نتیجہ میں کشمیریوں کے دلوں میں بھی اُس کی جگہ بنی رہی۔

اُس کے وُرودِ کشمیر کے وقت یہاں ایک بھی خاتون استاد کا وجود نہ تھا تعلیم نسواں بالخصوص اکثریتی فرقے کی نظر میں ایک شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُس کی بے پناہ لگن جو وہ عورتوں کی فلاح کے لئے رکھتی تھی، طالبات

کو سکول جانے اور جدید زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کی موجب بنی۔ میری اپنی
بڑی بیٹی مِس میلنسن کے سایۂ عاطفت ہی میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئی۔

اُسے نہ صرف تعلیم نسواں کے اعلیٰ آدرش سے لگاؤ تھا بلکہ وہ خواتین
کی سماج میں برتری کو بھی عزیز رکھتی تھی۔ وہ کم سن شادی کے خلاف سینہ سپر
ہوئی اور عورت کو عزّت و وقار کا مقام دلانے میں ہمہ تن جُٹ گئی۔

اُس نے عورت کے بارے میں رائج کئی سماجی تعصبات اور اُن
مصائب کے خلاف لڑا جن میں یہاں کی خواتین مُبتلا تھیں۔ یہاں کی عورتیں
گھر سے باہر آکر کھُلی ہوا میں سانس نہیں لے سکتی تھیں۔ مِس میلنسن ہی
نے گرل کیمپوں کا اہتمام کرکے طالبات کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکالا۔ وہ
خود بھی ریاست کے گرل گائیڈ کمشنر (Girl Guide commi-
ssioner) کے منصب پر فایز رہی۔

مِس میلنسن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مُنکسر المزاج تھی اور
ساتھ ہی تدبر، تحمُّل کا پیکر بھی۔ اُس کی رگوں میں انسانی خون رواں دواں
تھا لیکن وہ عمل کے جوش و جذبہ سے بھی مملو تھی۔ جہاں وہ نو خیز طالبات پر
محبت و شفقت کی بارش کرتی تھی وہاں وہ اُن کے لئے نظم و ضبط کی بھی بڑی
پابند تھی۔ جب وہ پہلی بار سرینگر آئی تو فتح کدل کے گرلز سکول کی نوعیت
نہایت معمولی تھی۔ اُسی کی شفقت و نگہداشت میں وہ پروان چڑھا۔ جب بھی
میں مِس میلنسن کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے سامنے ایک سائیکل سوار خاتون
کی شبیہہ اُبھرتی ہے جو نہایت انکسار و عاجزی کے ساتھ گھر گھر گھومتی ہے

اور لوگوں کو تعلیم نسواں کی طرف راغب کرتی ہے۔

مس میلنسن سے اعلےٰ و ادنےٰ سب کشمیری والہانہ محبت کرتے تھے اُس کے بارے میں عام طور یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں کے ذی حشم لوگ سڑک پر جاتے ہوئے اپنی گاڑیں روک، نیچے اُتر کر آداب بجا لاتے۔ وہ چوراہے پر تعینات پولیس سپاہی سے بھی ملتی اور اُس سے گھر کے حالات پوچھ لیتی۔ وہ کئی بار ہمارے گھر آئی۔ کیونکہ میری ایک دختر بھی اُس کے سکول میں پڑھتی تھی۔ میں بھی اُن خوش بخت لوگوں میں سے ہوں جن کو انگلستان میں مس میلنسن سے اُسکی زندگی کے آخری ایّام ملنے کا اِتفاق ہوا۔ وہ اپنے قیام کشمیر کی یاد تازہ کرتی تھی اور سادہ دِل مہمان نواز کشمیریوں کے بارے میں رطب اللسان تھی ہم اُسکے بڑے احسانمند ہیں۔"

مِس میلنسن جون ۱۹۷۰ء میں اس دارِ فانی کو چھوڑ کر چلی گئی لیکن اُس کی حیاتِ مستعار کے کارنامے کشمیری عوام خصوصاً کشمیری خواتین کے دِلوں پر تا ابد نقش برسنگ رہیں گے۔ شاید میر نے ایسی ہی شخصیات کے لئے کہا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے اِنسان نِکلتا ہے

○

کتابیات

- ہسٹری آف سرینگر۔ ۱۸۴۶ء-۱۹۴۷ء، ڈاکٹر محمد اسحاق خان.
- کشمیر اِن سنلائٹ اینڈ شیڈ، ٹنڈل بِسکو۔
- کرسچینیٹی اِن جموں اینڈ کشمیر، (ص-۳)

بشیر اختر

رسا جاودانی

نکلتا ہوا قد ــ داڑھی مونچھ سے صفا چٹ چہرہ ـ سر پر برف جیسی سفید کسی ہوئی دستار. بھرے بھرے گالوں پہ عام پہاڑی لوگوں کی طرح کشمیر کے مشہور عنبری سیب کی سی لالی اور اداہیں بزرگانہ شان اور فلسفیوں کی گمبھیرتا۔ میں نے رسا جاودانی کو ایک بار کلچرل اکادمی کی ایک محفل مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ وہ جنوبی کشمیر کے پہاڑی علاقہ بھدرواہ سے آئے تھے۔ جہاں کے کھردرے کمبل مشہور ہیں۔ جو لیوں تو گرم ہیں لیکن ان کے موٹے موٹے بال تنِ نازک پہ ببول کے کانٹے لگتے ہیں۔ پہلی بار میں نے انہی کھردرے کمبلوں کے توسط سے بھدرواہ سے آئے ہوئے اس خوش پوشاک شخص کے لئے ایک تصور باندھا تھا جو کچھ کم دلفریب نہیں تھا۔ لیکن جب اُس نے اپنے اس مطلع سے ع "گر دِزاو کمہ تام تراٗیے لولو" غزل کا جادو جگایا میں پھڑک اُٹھا۔ اب تک جو بھی اصحاب آئے تھے انہوں نے سوائے پولیٹیکل تقصیریز کے اپنے منظوم کلام میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ لیکن نہ معلوم رسا کا پہلا ہی

شعر کیوں دِل کو بھا گیا۔

میرے خیال میں عورت کا سب سے بڑا حُسن اس کا عورت پن ہے، نِسوانیت ہے۔ چُست پتلون، شارٹ کٹ کوٹ اور لڑکوں جیسے چھوٹے چھوٹے بال لئے جب بھی کوئی خاتون بازار میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے تو ذہن ایکدم تذبذب میں گرفتار ہو جاتا ہے آیا شخص مذکور کو عورت کہیں یا مرد۔ دل اُسے عورت ماننے پہ اس لئے تیار نہیں کہ اس میں نِسوانیت نہیں ہوتی۔ نہ انداز و ادائیں اور نہ ہی پہناوے ہیں۔ مرد وہ اس وجہ سے نہیں لگتی کہ اس میں مردوں جیسا وقار نام کو بھی نہیں ہوتا۔ کوٹ، پتلون اور اس پر لپ اسٹک — جیسے آدھا مرد اور آدھی عورت — اردستری!

بالکل اسی طرح جیسے غالبؔ کی زمین، میرؔ کے الفاظ اور موضوع اشاریئے کے اور گرام والے باٹے! غرض پسند سیاست کاروں کی مدح سرائی۔ ظاہر ہے جو کان اب تک رسولؔ میر شاہ آبادی کے رومان پرور گیتوں سے آشنا رہے ہوں۔ وہ "جنگ باز خبردار" والے گیت سُن کر کیسے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

رساؔ کے کلام کو جب میں نے اپنے اندر جذب کیا تو سُن کر طبیعت پھڑک اُٹھی۔ "مہمان اعلیٰ پایے لولو" والی ترکیب تو اب تک رسولؔ میر کے یہاں مستعمل تھی۔ یا کہیں کہیں مہجورؔ نے برتی تھی۔ رساؔ کی زبانی ایسی تراکیب کا برمحل استعمال دیکھ کر نہ صرف ماحول پر شگفتگی چھا گئی بلکہ ہر طرف سے واہ واہ اور مکرر کے نعرے سُننے کو ملے۔ بھدر واہ جیسے غیر ادبی علاقے سے رساؔ جیسا حُسن شناس اور رومان پرور شاعر کا ورود۔ دِل کو یقین نہیں آیا۔

رسا کے بارے میں ایک بات مشہور ہے جو میرے خیال میں سراسر مبالغہ ہے۔ رسا پر لکھنے والوں نے اس کی مقبولیت کا طومار غلام نبی ڈولوال کے سر باندھا ہے۔ حالانکہ غلام نبی ڈولوال نے ان کی جو بھی غزلیں گائی ہیں وہ اتنی محسورکن نہیں جتنا ان کا شہرہ ہے۔ راج بیگم کی گائی ہوئی غزل ع "مشرآو تھس جانا نہٕ" غلام نبی ڈولوال کی "دوٚیُن وَ نار ہم ژھ کیا" سے ہزار گنا اثر رکھتی ہے۔ یہی حال غلام حسن صوفی کی گائی ہوئی غزل "ژٕٹے لوگتھ سو رمہ چشمَن" کا ہے۔ قبول عام سے متعلق مہجور کے بارے میں بھی طومار باندھے گئے ہیں۔ کئی لوگ ان کی مقبولیت محمود شہری کے سر باندھتے ہیں اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بانگا فون کمپنی نے ان کی غزلوں کو CURRENCY دی۔ اگر قبول عام صرف MEDIA کے ماتحت ہوتا تو ہمارے آج کے شاعروں کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک ذریعہ تھا۔ پھر بھی کوئی شاعر آجکل مہجور کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکا۔ صوفی شاعروں کے پاس MEDIA کے ذرایع تھے ہی نہیں پھر بھی ان کے نام بچے بچے کی زبان پر ہیں۔

رسا خود بھی موسیقی سے شغف رکھتے تھے اس پر طرہ یہ کہ لفظوں کے انتخاب پر قدرت رکھتے تھے۔ مضامین ایسے باندھتے تھے کہ سننے والا سر دھننے پر مجبور ہوتا تھا۔ شعر فہمی اور سخن شناسی سے متعلق رسا کے بارے میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔

کہتے ہیں کہ رسا کسی روز چند ہم سخن اصحاب کے ساتھ محو گفتگو تھے باتوں باتوں میں موازنۂ غالب و اقبال کی بات چھڑ گئی۔ رسا صاحب سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اقبال تو ایک گرد خار ہیں۔ بہت

بڑے سمندر جیسے کوئی بڑا جہاز ہی پار کرسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں غالب
یوں سمجھئے کہ ایک پہاڑی ندی ہے۔

اور جب رسا سے ان کی ذاتی پسند کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ
گویا ہوئے۔ سمندر کو تو بڑا جہاز ہی پار کرسکتا ہے۔ میں تو کشتی بھی نہیں۔ ہاں
جب پیاس لگتی ہے تو ندی کے پاس ہی چلا جاتا ہوں۔

رسا جاودانی نے کسی تحریک، مسلک یا پارٹی وغیرہ کو اپنا موضوع
شعر نہیں بنایا۔ ان کی کلیات میں مجھے کسی بھی سیاسی لیڈر کا کوئی قصیدہ
نہیں ملا۔ حالانکہ رسا کے ہم عصروں نے ایسے موضوعات پر لکھنے میں
کوئی بخل نہیں برتا ہے اور موضوعاتی شاعری کرتے کرتے ہمارے اکثر
اُستادانِ سخن بھی تک بندی تک آ گئے ہیں۔ خاص کر جب وہ اعشاریہ سکول
اور اوزان یا خاندانی منصوبہ بندی پر قلم اُٹھاتے ہیں تو ان کی شاعری محض
تُک بندی بن کر رہ جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رسا جاودانی نے شہر سے
سینکڑوں میل دور بھدرواہ کے ایسے ماحول میں عمر گزاردی جہاں شاعری
کا INSTITUTION ان کے لئے چالیس پچاس روپے کے سرکاری CONTRACT
کا مرہونِ منت نہیں تھا۔ ورنہ ان کے معاصرین کا المیہ ہے کہ ؎

شاعری جسے سمجھتے تھے دل کی بات

اب وہ پیٹ کی داستان ہو گئی ہے

رسا کا گھریلو ماحول شاعری جیسی غیر منافع بخش سرگرمی کے لئے خاصا
موزون نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جس گھر کی کاروباری مصروفیات ہوں۔ روپے
کی زبردست ریل پیل ہو۔ بہی کھاتوں اور روزناچوں کا چرچا ہو، گماشتوں کی
فوج ہو، وہاں شاعری جیسے بے کار مشاغل کے لئے کسے دل چسپی ہوگی۔ رسا کے

والد کی بھدرواہ کے بازار میں پانچ بھری پُری دکانیں تھیں۔ ایک دن یہ دکانیں سیلاب کی نذر ہوگئیں اور یوں رسؔا کو تلاش معاش کے لئے شہزادگی کو خیرباد کہہ کر معلمی اپنانا پڑی۔ وہ ساری زندگی ہائی سکول کے بچوں کو اردو اور فارسی پڑھاتے رہے اور جب تک کہ مدخولۂ گورنمنٹ رہے بھدرواہ سے تبدیل نہیں ہوئے۔ ایک ہی مدرسے کے ساتھ عمر بھر کی وابستگی نے اگرچہ ان کی زندگی میں تھوڑا سا جمود طاری بھی کر دیا تھا لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ رسؔا جیسے جوہر شناس نے ادب نواز طالب علموں کی بہت بڑی کھیپ پیدا کر دی۔ ان طلبا میں سے کئی آج کل بڑی بڑی اسامیوں پر فائز ہیں۔ چند ایک کئی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ رسؔا خود تو کسی بھی یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ نہ تھے لیکن ان کے طالب علموں میں اکثر ایسے بھی ہیں جو نہ صرف خود ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں بلکہ دوسروں کو ڈگریاں دینے پر مامور ہیں۔

رسؔا کو اُردو اور فارسی دونوں زبانوں پر خاصی قدرت حاصل تھی ان بڑی زبانوں کے ادب کا رسؔا نے بھرپور مطالعہ کیا۔ ان میں لکھے گئے ادب پاروں پر گھنٹوں تبصرہ کرنے کی قدرت ان کو حاصل تھی۔ لیکن جو لگاؤ انہیں کشمیری زبان کے شاعر رسول میر سے رہا ہے وہ کسی دوسرے شاعر سے نہیں۔ ان کی شاعری پر رسول میر کی چھاپ ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

ہند، سندھ شیراز، پھیرِتھ رسؔا آو
سیر گو میرِ ما دانئے تہٕ لولو

رسا کے آباؤ اجداد نے اسلام آباد کشمیر سے ترک وطن کر کے بھدرواہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ رسا سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ذات کے خانے میں وہ اپنے نام کے آگے "دیو" لکھا کرتے تھے۔ والد کے جاہ و ثروت کی بدولت ان کا بچپن نازو نعم سے گذارا۔ مگر جب جوانی کا دور آیا تو قسمت نے طوفان کے تھپیڑوں سے روشناسی کرا دی۔ آفات سماوی نے گھر پر یوں میں معاشی مشکلات تو پیدا کر ہی دی تھیں لیکن ذہنی پراگندگی اُس وقت سے شروع ہوئی جب ایک صوفی منش بزرگ کے زیر سایہ ترک دنیا تک حالت پہنچی۔

ان ہی پریشانیوں نے شاید رسا کے اندر حقیقی شاعر کو بیدار کیا۔ فطرت کی رنگینیوں نے اتنا متاثر کیا کہ اس طرح کے نغمے پھوٹ نکلے ؎

تو نقاب اُلٹ دے تو ہو سحر، تیری زلف بکھرے تو نیم شب
یہی اپنے لیل و نہار ہیں، یہی صُبح ہے یہی شام ہے

ان کی خانہ زندگی کی داستان بہت سادہ ہے۔ رسا کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی صغرسنی میں ہوئی تھی جس کے نتیجے میں دو فرزند ہوئے۔ بڑے فرزند بشیر احمد تاج بلاک آفیسر تھے اور چھوٹے فرزند خیرات محمد پاکستان کی لاہور یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے پر فائز۔ دوسری بیوی سے ایک فرزند اور چار لڑکیاں ہوئیں۔

رسا جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی پہلی مرکزی کمیٹی کے ممبروں میں سے تھے۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں جس وقت اکادمی کی پہلی مرکزی کمیٹی بنی اور اس وقت کے وزیر اعظم نے جناب رسا کو دیکھا تو ان کے گرویدہ ہو گئے۔ چنانچہ رسا صاحب کو وہ خصوصی طور مشاعروں میں پڑھنے کے لئے بلوایا کرتے تھے۔

رسا کے بہی خواہوں نے از روئے عقیدت انہیں صوفی شاعروں میں سمونے کی سعی کی ہے. وہ کھینچ تان کر رسا کے اُن اشعار کو بھی تصوّف کے معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر رومانی ہیں اور جو رسول میر کے تتبع میں لکھے گئے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ رومانیت کشمیری سماج اور ادب کی غالب روایات سے انحراف کہلاتا ہے. سیاسی و سماجی زیادتیوں نے یہاں لوگوں کے مزاج میں انتہائی حد تک قنوطیت بھر دی ہے۔ حضرت شیخ العالمؒ سے لیکر عبدالاحد زرگر تک جو بھی شعراء یہاں کے لوگوں میں مقبول ہوئے سب کے سب PESSIMISM کے علمبردار رہے ہیں. چنانچہ ان ہی بزرگ شاعروں کی کاوش نے لوگوں کے مزاج میں مایوسیاں اس حد تک بھر دی ہیں کہ لوگ شوخی ظرافت اور الھڑپنے سے نہ صرف دور بھاگتے رہے ہیں بلکہ رومانیت کا تصوّر ذہن میں آتے ہی ناک بھوں چڑھانے لگے۔ کشمیر کے آخری خودمختار بادشاہ یوسف شاہ چک کو اس وجہ سے تاج و تخت سے دست بردار ہو کر اکبر اعظم کی قید میں جانا پڑا کہ نہ صرف وہ خود موسیقی کا دلدادہ تھا بلکہ اس کی ملکہ حبہ خاتون بھی زندگی کے حسین لمحات کی قدردان تھی۔ حبہ خاتون کو ہمارے کئی ایک مورخین نے "کال گرل" جیسے خطابات سے نوازنے میں فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ رسول میر حالانکہ محمود گامی سے بہتر شاعر رہے لیکن مذکورہ حلقوں میں اپنی رومان پسندی کی وجہ سے محمود گامی جیسی عقیدت نہ پاسکا۔ اس کی قبر پر نہ تو چراغ جلائے گئے اور اس کے ساتھ کوئی معجزہ ہی منسوب کیا گیا. رسا جاودانی کے عقیدت مندوں نے شاید انہی وجوہات کی بنا پر ان کے رومانی شعروں سے تصوّف کے رمز ڈھونڈھنے کی سعی کی ہے۔ حالانکہ رومان پرور شاعر ہی کی حیثیت سے رسا جاوداں ہیں۔

رسول میر کے ساتھ رساجاودانی کی وابستگی نہ صرف نفسیات کے لحاظ سے ہے بلکہ رسا کی زبان بھی کسی حد تک رسول میر کی زبان سے میل کھاتی ہے۔

رسا نے لفظی تکرار کا فن رسول میر ہی سے مستعار لیا ہے ؎

کم خواب چشمے وُتھرِتھ تڑاوس
کمخاب قدمہ جہِ جاپے لولو

لفظی تکرار کی ایسی مثالیں رسول میر کے یہاں بہ کثرت ملتی ہیں اور ان کے علاوہ اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں۔ رسا نہ صرف رسول میر ہی کی طرح موسیقی سے شغف رکھتے تھے بلکہ لفظوں کی میناکاری میں اپنے پیشرو ہی کی طرح ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک اچھے مصور کی طرح ان کے خاکے LOUD نہیں۔ وہ شوخ وشنگ رنگوں کے استعمال سے دیکھنے والی آنکھوں کو صرف خیرہ کرنے میں یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کے رنگ اندرونی جذبات میں طلاطم پیدا کرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے پیکروں میں صرف رنگوں کی آمیزش نہیں بلکہ جذبات کی رنگا رنگی بھی ہے ؎

گرِ دڑاو کمہِ تام تڑاپے لولو
اَسہِ گیہِ کم کم راپے لولو

رسول میر کے یہاں ظرافت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی اس کے مقابلے میں رسا کے کلام میں مزاحیہ اشعار بدرجہ اتم موجود ہیں لیکن مزاح پیدا کرنے کا رسا کا اپنا انداز ہے۔ بہت ہی سلجھا ہوا، آداب کا پابند ؎

مقتدی یوَ بنِدرِ پنکھا بنہِ کرِتھ
زئیو یہ سجداہ کوٗر امامن وارِیاہ

شاعروں کا خاصہ ہے کہ محبوب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے

ملاتے ہیں۔ محبوب کا لباس، اس کا قد و قامت، زلف و رخسار، محبوب کی ادا وغیرہ وغیرہ

لیکن رسا کو دیکھئے کتنے حقیقت پسند ہیں ؎

مَس پیالہ اگر ز یا د ہ برے مَن پھیری

ژوُرمہ کھتہ جُر یتھ وآلی گرے گو بنے کَن

کشمیر کی تعریف میں لکھے گئے فیضی کے اس شعر پر کون سر نہیں دھنتا ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید

گر مرغ کباب است با بال و پر آید

مجھے یہ کہنے کے لئے معاف کیا جائے کہ "پدرم سلطان بود" کا قائل یوں تو ہر کشمیری ہے۔ شاید اس لیے کہ دنیا کی ہر تاریخی شخصیت کو کشمیری الاصل ثابت کرنے کی بھرپور کوشش ہر زمانے میں کی گئی ہے۔ کبھی گن ڈے کو کشمیری جتلایا جاتا ہے اور کبھی ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کو۔ شہنشاہ جہاں گیر کا کشمیر کی تعریف میں کہا ہوا "ہمیں است و ہمیں است و" والا مصرعہ ان لوگوں کو بھی ازبر ہے جو پوچھنے پر ایک سے سو تک گنتی بھی نہیں گن سکتے۔ فیضی کا مذکورہ بالا شعر سن کر اگرچہ ہر کشمیری کے چہرے پر فخر و انبساط کی سرخی چھا جاتی ہے لیکن رسا جیسے حقیقت پسند شاعر نے ایسی مبالغہ آرائی پر کان پکڑتے ہوئے کہا ہے ؎

ژُباز بہ چھس نہ وُڈا وَ کھ کو تر

بوُد آسہ تھہنڈ ماز نہ کھو ٔ تمتُ سیخن

رسول میر عشق مجاز کا شاعر تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو کبھی "کونگ" کبھی "پوشہ مال" اور کبھی "موختہ مال" کہہ کر بلاتا ہے جس کا پتہ اسے سوگام سے ملتا ہے۔ درد گاؤں کی اس خورد سال محبوبہ کو جو تماشوں میں جانی پہچانی جاتی ہے رسول میر نام لے لے کر پکارتا ہے۔ اس کے مقابلے میں رسا جاودانی اگرچہ موجودہ دور کے

شاعر ہیں لیکن رسول میر کا تتبع کرنے کے باوجود شرمیلے پن سے چھٹکارا نہیں پا سکے ہیں۔ انہوں نے کہیں بھی ایسی محبوبہ سے متعلق مبہوم سا اشارہ تک نہیں دیا ہے۔ نام لینا تو درکنار حالانکہ سے

نامہ یتکھ لیکھو شہر وگامن ڈاک خانئ ترآوِ دمے

جیسے اشارے اُن کے ہاں ملتے ہیں۔ اس قسم کا شرمیلا پن رساؔ جاودانی کی نجی زندگی میں بھی رچا بسا سا تھا۔ وہ بہت ہی کم گو تھے حالانکہ پیشے کے لحاظ سے اُستاد تھے۔ مجھے یاد نہیں اور نہ سنا ہے کہ انہوں کلچرل اکادمی کی مشاورتی کمیٹی کی میٹنگوں میں کسی بحث وغیرہ میں حصّہ لیا ہو۔ شریف النفس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی حد تک نفاست پسند تھے۔

رساؔ اُردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا اُردو کلام "نظم ثریا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور ان کے کشمیری مجموعہ کلام "نیرنگ غزل" پر انہیں انعام دیا گیا۔ رساؔ صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کلچرل اکادمی نے انہیں سنہ ۱۹۶۲ء میں خلعت فاخرہ سے بھی نوازا ہے۔

رساؔ جاودانی پیر پنچال کے اُس پر کشمیری زبان کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ جنوبی کشمیر میں اُن کا ہم سر نہ اب تک وجود میں آیا اور نہ ہی اگلے کئی برسوں تک آنے کی اُمید ہے۔ رساؔ نے اپنے وجود سے نہ صرف جنوبی کشمیر میں ہماری زبان کی کامرانی کا جھنڈا گاڑ دیا بلکہ اپنے ساتھ گلوکاروں اور ادب نوازوں کی بہت بڑی کھیپ کو وادیٔ کشمیر سے روشناس کروایا۔ افسوس کہ رساؔ کی رحلت کے ساتھ ہی ان ٹمٹماتے تاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی جو اُن کے یہاں فیضیاب ہوتے رہے تھے۔ یہ سارے فن کار ایک ایک کر کے گمنام سے ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے فن پاروں میں ابھی تک رساؔ کے معجزۂ فن کی تھوڑی سی رمق بھی نظر نہیں آتی سے

گئے دنوں کا سراغ لیکر کہاں سے آیا کدھر گیا وہ   عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

رشید تاثیر

یکم مئی ۱۹۸۰ء کو شمیم احمد شمیم چھتالیس برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ شمیم احمد شمیم نے اپنی مختصر سی عمر میں نہ صرف صحافت، ادب، بلکہ سیاسی میدان میں بھی اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ انتہائی درجے کے بیباک نڈر، قدآور قلمکار اور شعلہ بیان مقرّر تھے۔ شمیم احمد شمیم ایک حقیقت پسند صحافی کے طور پر ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ انہوں نے ایک باوقار صحافی کی طرح حقائق کو حقیقت پسند منظر میں پیش کر کے اپنی تحریروں میں داخلیت کو حاوی ہونے دینے کے باوجود حقائق کا منہ نوچنے کی سعی نہیں کی۔ وہ قلم اور زبان دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور اُن کے استعمال کا خوب گُر جانتے تھے۔ شمیم غضب کے مُقرّر، حاضر جواب ہونے کے علاوہ اپنی صلاحیتوں کے احساس

شمیم احمد شمیم
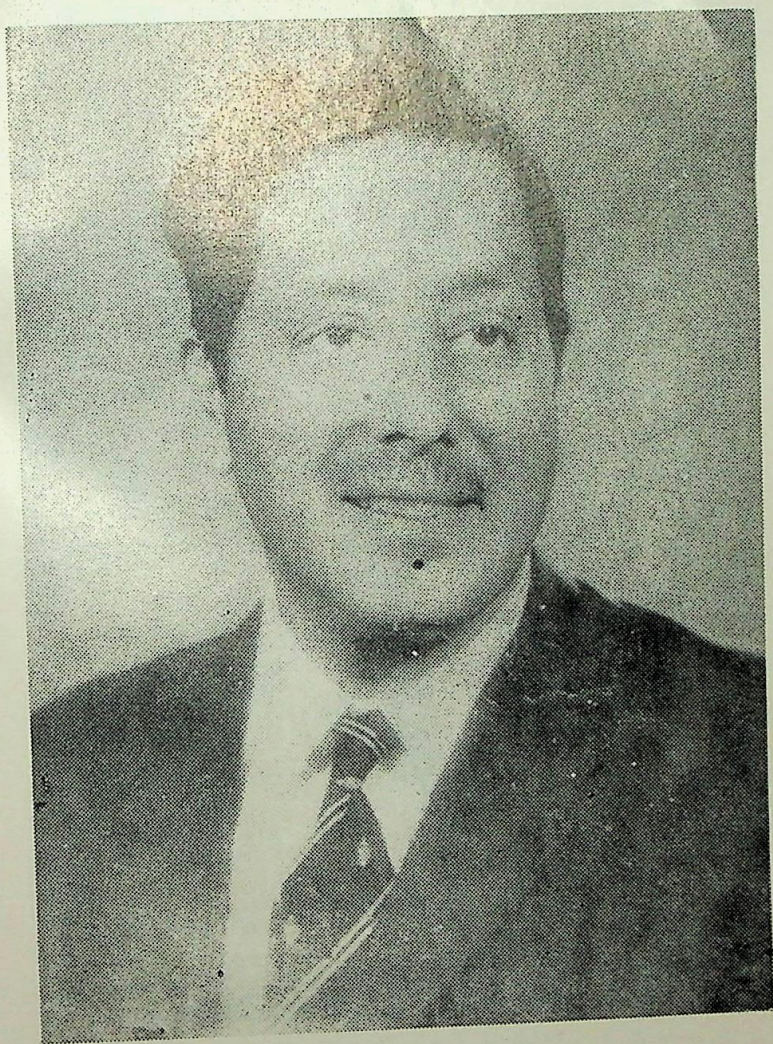
پریم ناتھ در ۔ (بشکریہ برج پریمی)

اور اعتماد کے بل بوتے پر جینے کے رمز سے بخوبی واقف تھے۔ شمیم کی زندگی پر کچھ لکھنے سے قبل لازم ہے کہ اُن کے خاندانی پس منظر کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے۔

اُن کے دادا محمد عبداللہ لون جو بعد ازاں مولوی عبداللہ وکیل کے نام سے معروف ہوئے ہیں قصبہ شوپیان کے متصل پورہ گاؤں میں اپنے دور کے خواندہ افراد میں شمار ہوتے تھے اور گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب کے ضلع گورداسپور کے مرزا غلام احمد قادیانی کا چرچا شد و مد سے سُنائی دے رہا تھا۔ محمد عبداللہ لون نے مہاراجہ پرتاب سنگھ کے شاہی طبیب مولوی حکیم نورالدین سے طب کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ مولوی نورالدین، مرزا صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ ان کی زبانی مرزا صاحب کے اوصاف سُن کر کافی متاثر ہوئے۔ قادیان جا کر نہ صرف ان کے شرفِ ملاقات کی سعادت حاصل کی، بلکہ ان کے ارباب معتقدین میں شامل ہو کر واپسی پر سرینگر کے کاچگری محلہ میں بود و باش اختیار کر کے مرزائیت کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ انتہائی زیرک اور جہاں دیدہ شخص تھے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے دائرہ اثر کو بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے طب کے بجائے قرآن و حدیث کے درس و تدریس کو اپنایا جسکی بناء پر خود بخود اُن کے نام سے مولوی کا لفظ جُڑ گیا۔ اسی زمانے میں الحاج منشی محمد اسحاق مرحوم کے والد نے اپنے ایک مکتوب میں مرزا غلام احمد قادیانی کی توجہ روزبل خانیار سرینگر کی ایک قدیم قبر کی جانب مبذول کرائی۔ مرزا صاحب نے اس کی تحقیق مولوی عبداللہ کے سپرد کی اور اخذ شدہ نتائج کے طور پر اس قبر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا

مقبرہ قرار دیکر اپنے علم و معروفت کا ڈھول پٹوایا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی تخت نشینی تک ہماری ریاست میں وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے کسی خاص تعلیمی سند کی ضرورت نہیں ہوا کرتی تھی۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا آدمی معمولی سا امتحان پاس کر کے وکیلوں کی صف میں شامل ہو جاتا تھا۔ مولوی عبداللہ نے یہ سند بھی حاصل کر لی اور اپنے دور کے کامیاب وکلاء میں شمار ہونے لگے جس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو جب سنٹرل جیل سرینگر میں عبدالقدیر کے مقدمہ کی سماعت ہوئی تو ملزم کے وکلاء میں مولوی عبداللہ سر فہرست تھے۔

مولوی عبداللہ وکیل کا کشمیر کے ابتدائی سیاسی دور میں خاصا عمل دخل رہا ہے۔ لیکن مرزائیوں کے خلاف میرواعظ کشمیر مولانا یوسف شاہ کی مہم جوئی نے نہ صرف انہیں مرزائیت کو پھیلانے سے روکا، بلکہ سیاسی میدان میں بھی پیچھے دھکیل دیا۔ بعد ازاں مولانا محمد سعید مسعودی کی قادیانیوں کے خلاف باضابطہ مہم نے اُن کے دائرہ احباب کو بھی محدود کر دیا۔

۱۹۳۸ء میں جب جناب شیخ محمد عبداللہ نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں مبدّل کرنے کے لئے مسلم زعماؤں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے متعدد میٹنگیں کیں۔ اس سلسلے کی آخری نشست خواجہ غلام محمد کمندر گر کے دولت خانہ واقعہ دری بل میں دو دن تک ہوتی رہی جہاں شیخ صاحب نے نیشنل کانفرنس کو قائم کرنے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ میٹنگ کے اختتام پر مولوی عبداللہ وکیل نے انہیں طعنہ دیتے ہوئے کہا "تم ہندوؤں کے ہاتھوں

ہو چکے ہو!" شیخ صاحب نے طیش کھا کر خانیار میں ایک جذبات برگشتہ تقریر کی۔ ردِّ عمل کے طور پر ان کے حامیوں نے خواجہ غلام محمد گندن نگر کے مکان پر قادیانی ہونے کے الزام میں پتھراؤ کیا۔ ابھی یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ مولوی عبداللہ نے اپنے پنجابی نبیؑ کو طلاق دیکر ایران میں مظہرِ الٰہی کا دعویٰ کرنے والے بہاؤ اللہ کی اُمّت بنکر اپنے تئیں بہائی ہونے کا اعلان کیا اور اپنے آپ کو دائرۂ اسلام سے خارج کرنے میں آسودگی محسوس کی۔ مولوی عبداللہ کی وفات پر مسلمانوں نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار کیا جس کی بناء پر ان کے بڑے بیٹے مولوی عبدالرحیم نے تحریری طور پر اعلان کیا کہ وکیل صاحب نے مرنے سے قبل باطل عقیدے سے توبہ کی تھی اور دائرۂ اسلام میں شامل ہوئے تھے۔ اس پر قادیانیوں نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور برزلہ باغات میں سپردِ خاک کیا۔

مولوی عبداللہ وکیل کا تیسرا بیٹا محمد یعقوبؒ جو اپنے دوسرے بھائیوں کی نسبت بہت کم پڑھا لکھا تھا لیکن مرزائیت کا زبردست مخالف تھا، نے ناسنور گاؤں میں ایک قادیانی لڑکی سے شادی کی۔ اس علاقے کے ایک بارسوخ مرزائی خواجہ عبدالرحمان ڈار نے جو ریاستی پرجا سبھا کا ممبر بھی تھا انہیں مشورہ دیا اب تم بھی مرزا صاحب کی بیعت کرلو۔ محمد یعقوب کے انکار پر اُن کے خلاف محاذ آرائی شروع ہوئی اور سوشل بائیکاٹ کیا گیا۔ بقول شمیم احمد شمیم:

" گیارہ برس کی عمر میں، میں نے قادیانیوں کے ایک اجتماع میں اپنے والد کے خلاف تقریر کرتے کہا: میرا باپ گمراہی کے راستے پر چل رہا ہے خدا اُسے صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دے۔"

سوشل بائیکاٹ کی اس خبر نے شوپیاں کے دین داروں کو انہیں پناہ دینے اور اُن کی حوصلہ افزائی پر اُکسایا۔ اُنہیں شوپیاں کی زیر تعمیر جامع مسجد کا حساب کتاب لکھنے پر ملازم رکھا گیا جسکی بناء پر انہوں نے وہیں سکونت اختیار کی۔ محمد یعقوب کی چار بیٹیوں اور دو بیٹیوں میں شمیم احمد شمیم ۱۹۳۴ء میں ناسنور میں ہی پیدا ہوئے۔ انہوں نے قادیانیوں کے زیر سایہ پرورش کے باعث اپنی ابتدائی عمر میں ہی تقریر کرنے اور بحث و تمحیص میں حصّہ لینے کی مہارت حاصل کی قیام شوپیاں کے دوران ان کے والد نے ریاستی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی اور نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے۔

۱۹۴۲ء میں کوئٹ انڈیا تحریک کی پاداش میں ہندوستان بھر کے جملہ کانگریسی رہنما گرفتار کئے گئے۔ جون ۱۹۴۵ء میں وائسرائے ہند لارڈ ویول کے ایک اعلان کے تحت تمام اسیرانِ کانگریس، مسلم لیگی لیڈروں سے صلاح و مشورہ کرنے کے لئے رہا کئے گئے تاکہ ان دو جماعتوں کے سیاسی سمجھوتہ کے نتیجے میں ہندوستان کی آزادی عمل میں لائی جائے۔ ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو وائسریگل لاج شملہ میں گاندھی جناح کانفرنس شروع ہوئی۔ ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول نے کانفرنس کی آخری نشست میں کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کیا۔ اس طرح ہندوستان کی اہم سیاسی تبدیلی سے پہلے جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے ۳-۴-۵ اگست ۱۹۴۵ء کو سوپور میں نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا اعلان کیا تھا۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کی کوفت مٹانے اور شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی نظریہ کو تقویت اور حوصلہ افزائی کی خاطر کانگریسی لیڈروں نے جوق در جوق اس اجلاس

میں شرکت کرنے کے لئے سرینگر آنا شروع کیا جن میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا
ابوالکلام آزاد، مسز گاندھی، عبدالغفار خان ان کا داماد یحییٰ خان، جے نرائن
ویاس، کنہیا لال ودیا، شاکر علی، اچھل ایشور پرشاد، میاں افتخار
الدین اور اوپادھیا وغیرہ شامل تھے۔ جلسہ کے اختتام پر پنڈت جواہر لال نہرو
نے شیخ محمد عبداللہ سے کونسر ناگ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ شیخ صاحب نے
شوپیاں نیشنل کانفرنس کو ہدایت بھیجی کہ پنڈت نہرو کا بے مثال استقبال کیا
جائے۔ نیشنل کانفرنس کی ساخت کو زیاں پہنچانے کیلئے ریاست کے وزیر اعظم
رام چندر کاک نے پورے علاقے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے استقبال کو ناممکن
بنایا۔ گرفتاریوں سے بچنے اور ناخوشگوار واقعات سے انحراف کرنے کا طریقہ ایسے تلاش
کیا گیا تاکہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ایک آرگنائیزیشن ینگ بوائز
ایسوسی ایشن کے نام پر قایم کی گئی جس کے صدر محمد یوسف ٹینگ اور سیکرٹری
شمیم احمد شمیم چُنے گئے۔ اس طرح جہاں پنڈت جی کا شاندار استقبال ہوا وہاں
شمیم احمد شمیم کو بھی کم عمری میں ہی ایک بڑا اعزاز حاصل ہوا۔

شمیم احمد شمیم نے ۱۹۵۰ء میں میٹرک کا امتحان شوپیاں میں ہی
پاس کیا۔ اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے ایس پی کالج سرینگر میں داخلہ لیا۔ شمیم
کے والد بھی شوپیاں سے سرینگر آئے اور اپنے بڑے بھائی ایم اے صابر
جو ۱۹۴۹ء میں پاکستان چلے گئے تھے کے مکان واقع کاچگری محلہ میں قیام کیا
یہیں ان کا انتقال ہوا اور زیارت سید منصور صاحب کے قبرستان میں دفنائے
گئے۔ شمیم احمد شمیم کی ابتدائی زندگی کے یہ دن بڑے ہی صبر آزما تھے اکثر وہ ان

دنوں کی یاد دردناک لہجے میں بیان کرتے تھے۔ غرض ان کے والد کی وفات کے بعد سارے کنبے کی کفالت ان کی والدہ کو اٹھانی پڑی جو غالباً زیادہ سے زیادہ ۵۰ روپے ماہوار مشاہرے پر معلمہ تھیں شمیم کا بھائی ممتاز احمد جو کچھ عرصہ بعد پاکستان چلا گیا اور وہیں جاں بحق ہوا۔

ان حالات میں گو کہ شمیم کا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنا محال تھا لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ کر ایس، پی، کالج کے پروفیسر میر نصراللہ کی دوستی، حوصلہ افزائی اور دست شفقت نے ان کے عزائم کو استحکام بخشا۔ شمیم نے کالج کے ابتدائی ایام میں ہی کالج میگزین میں پروفیسروں کے قلمی خاکے لکھ کر اپنا لوہا منوایا جو کافی سے زیادہ پسند کئے گئے۔ کالج کی جانب سے انہیں بیرونی ریاست کے کئی دوروں پر بھیجا گیا جہاں انہوں نے اپنی ذہانت اور حاضر جوابی کے عوض کئی انعامات اور سرٹیفکیٹ حاصل کئے۔ شمیم نے ۱۹۵۱ء میں ایف، ایس، سی کا امتحان پاس کیا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتے تھے لیکن میڈیکل نشست حاصل نہ کر سکے۔ پروفیسروں کے مشورے پر بی ایس سی میں داخلہ لیا۔ دو بار فیل ہوئے۔ ۱۹۵۳ء کے سیاسی انقلاب نے بخشی غلام محمد کو ریاست کا وزیر اعظم بنایا اور پروفیسر میر نصراللہ کو اُن کا داماد۔ ان ہی دنوں شمیم علی گڈھ سے بی، اے پاس کر کے آئے تھے۔ میر نصراللہ کی وساطت اور سفارش سے محکمہ اطلاعات میں ملازم ہوئے۔ ماہنامہ "تعمیر" کی ادارت انہیں سونپی گئی۔ محمد یوسف ٹینگ ان کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنے لگے۔ اس دور میں "تعمیر" کے دو خوبصورت ضخیم اور یادگاری شمارے خالد کشمیر بخشی غلام محمد اور شاعر کشمیر غلام احمد مہجور کے نام

سے منظرِ عام پر آئے۔

اگست ۱۹۵۳ء میں اقتدار منتقل ہونے کے ساتھ ہی بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق کے درمیان سیاسی اور نظریاتی رسہ کشی شروع ہوئی۔ صادق صاحب کے کلچرل کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لئے کلچرل فورم کا وجود عمل میں لایا گیا اور بخشی صاحب کے حمایتی ہفت روزہ اخبار "حقیقت" میں خواجہ غلام محمد صادق کے خلاف شمیم احمد شمیم نے زورِ قلم کے جوہر دکھائے۔ اس سے نہ صرف وہ وزیر اعظم کے مصاحبوں میں شمار ہونے لگے بلکہ ان کا مکمل اعتماد بھی حاصل کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں تمام سرکاری سہولیات اور رعایتیں میسر رکھی گئیں۔ بلکہ ترقی دیکر کلچر افسر کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ ان خوشگوار دنوں میں شمیم صاحب کے دائرۂ احباب میں بھی اضافہ ہو گیا جن میں سرینگر چسٹ ڈزیز ہسپتال کی سپرنٹنڈنٹ شانتا منشی صاحبہ بھی شامل تھیں۔ ان کے ساتھ گہرے مراسم کو شمیم کی سیمابی طبیعت کے چنچلے پن نے دشمنی میں بدلا۔ بات بڑھ گئی۔ شمیم کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ وزیر اعظم بخشی غلام محمد سے شکایت کر کے میرے لئے مشکلات پیدا نہ کردیں اس احساس کے جاگتے ہی انہوں نے "پہلا آنے والا اوّل کہلائے" کے تحت میر نصر اللہ کو بخشی بشیر کی موجودگی میں شانتا منشی کے خلاف بھڑکانے کی غرض سے کہا کہ وہ بخشی صاحب کی بیٹی کے نام دشنام طرازی کر رہی ہے۔ نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد۔ یہ سنتے ہی بخشی بشیر طیش میں آ گیا۔ چسٹ ڈزیز ہسپتال جا کر شانتا منشی کو ترکی بہ ترکی سنانے کے علاوہ اس پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز

نہیں گیا اس واقعہ سے بخشی صاحب کی غلط ان پوزیشن مضحکہ خیز بنی تحقیق سے
پتہ چلا کہ یہ سب کارنامہ شمیم صاحب کی گلفشانی کا ردِ عمل ہے۔

اسی دوران مسز میر چندانی نام کی ایک جرنلسٹ ریاستی حکومت
کی مہمان بن کر سرینگر آئیں۔ ڈائریکٹر جنرل انفارمیشن پنڈت جانکی ناتھ زتشی
نے شمیم کو ان کے ساتھ بطور لیزان افسر رکھا جس دن وہ واپس جا رہی تھی شمیم
احمد نے ایئر پورٹ پہنچانے کیلئے سرکاری جیپ خود ڈرائیو کی۔ اتفاقاً برزلہ
روڈ پر مخالف سمت سے آتے ہوئے ان کی مڈبھیڑ بخشی غلام محمد سے ہوئی۔ جیپ کو رکنے
کا حکم دیا گیا۔ سرِ راہ وزیر اعظم نے مقدمے کی سماعت شروع کر کے دریافت کیا کہ
سرکاری گاڑی میں اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ شمیم نے کہا جناب میں ان کے ساتھ
سرکاری ڈیوٹی پر ہوں اور ایئر پورٹ چھوڑنے جا رہا ہوں۔ سرکاری گاڑی کو
ڈرائیور کے بغیر چلانے کی اجازت تم کو کس نے دی؟ اس سوال کا شمیم کے پاس
کوئی جواب نہ تھا۔ ایئر پورٹ سے واپسی پر شمیم کو اپنے دفتر کی میز پر فوری جموں
تبدیلی کا حکم نامہ پڑا ملا۔ مجبوراً جموں چلے گئے لیکن بخشی صاحب کی فطرت سے
واقف ہونے کی بناء پر ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور علی گڑھ سے ایل ایل بی کا
امتحان پاس کر کے سرینگر کی عدالت میں پریکٹس شروع کی۔

۱۹۶۳ء میں ان کی شادی خواجہ غلام محمد جالب کی صاحبزادی سکینہ
بانو سے ہوئی جن کے بطن سے ان کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ ۱۹۶۴ء
کے جون میں وکالت کے ساتھ ساتھ ہفت روزہ "آئینہ" سرینگر سے اجراء کیا
اور پل جھپکتے ہی ریاستی صحافت کے افق پر قد آور صحافیوں کی صف میں شمار

ہوگئے۔ شمیم کی صحافتی زندگی کا ایک یادگاری کارنامہ ہفت روزہ آئینہ کا
شخصیات نمبر ہے۔ انہوں نے اس خصوصی شمارے میں ریاست کے ہر شعبۂ زندگی
سے تعلق رکھنے والے کئی سرکردہ اصحاب کے قلمی چہرے پیش کئے۔ یہ شمارہ بہت
عرصہ تک زبان زدِ عام رہا۔ ذیل میں شیخ صاحب، مولانا مسعودی، سیّد میر قاسم
اور خواجہ غلام محی الدین قرہ کے خاکوں کے اقتباس ملاحظ فرمائیں۔ جناب
شیخ محمد عبداللہ کا تعارف کرتے انہیں بڑے ہی معصومانہ انداز میں سیاسی
بے گناہ ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ غالباً یہ خاکہ تشکیل دیتے وقت شمیم
کے ذہن پر شیخ صاحب کی ۱۹۵۳ء کی وہ تقریر رقصاں تھی جس میں انہوں
نے اپنے بارے میں خود ہی فرمایا تھا " مجھے غلط کار کہو غدار نہیں "۔ بہر حال
کیف خاکے کا اقتباس ملاحظ فرمائیں۔

" ۱۹۳۱ء کی صبح سے لیکر ۱۹۶۹ء کی شام تک ان کی زندگی کے ایک
ایک لمحے کا حساب کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی ہر سانس کشمیر کے غم اس کے
دُکھ درد اور ان کی خوشیوں سے عبارت ہے اور یہی خصوصیت انہیں دیگر
کشمیری رہنماؤں سے بلند اور ممتاز کر رہی ہے ——— کشمیری عوام نے ہمیشہ
ان کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے ان کے خلوص اور نیک نیتی کا اعتراف کیا ہے
۱۹۴۷ء کے فیصلے اور ۱۹۵۳ء کے انقلاب میں بظاہر کوئی ہم آہنگی نہیں اور
شیخ صاحب کے نکتہ چین اکثر اس تضاد کیلئے انہیں ہدفِ ملامت بناتے آئے
ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس ظاہری تضاد میں ایک معنوی ہم آہنگی
موجود ہے۔ کشمیر کے حسین اور خوشگوار مستقبل کا خواب ۱۹۴۷ء کے تاریخی فیصلے

کا خواب تھا اور ۱۹۵۳ء کا انقلاب اسی خواب کے ٹوٹنے کا نتیجہ تھا۔"

مولانا مسعودی ریاست کے واحد سیاست دان ہیں جو سیاسی طوفانوں میں اُبھرتے ہیں اور پُرسکون ماحول میں ڈوبتے ہیں۔ اس کا تجزیہ شمیم کی زبانی سُنیئے :

" موئے مقدس کی تحریک کے دوران تین نعروں نے جنم لیا" سازش کو ننگا کرو"۔" اصلی مجرم کو پیش کرو" اور" مولانا مسعودی زندہ باد"۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے سازش کو ننگا کرنے کی بجائے اُسے کپڑے پہنائے گئے ہیں۔ اصلی مجرم کو پیش کرنے کی بجائے نقلی مجرموں کو بھی رہا کر دیا گیا ہے اور مولانا مسعودی زندہ باد ہونے کی بجائے ایک سوالیہ علامت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اصلی مجرم کا نام تو ابھی تک زبان زد خلائق ہے لیکن مولانا ایک افسانوی کردار ہو کر رہ گئے ہیں وہ خود گوشہ نشین ہو گئے ہیں یا حالات کی سازش نے انہیں خلوت نشینی پر مجبور کر دیا ہے۔ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب مولانا کے پاس ضرور ہو گا لیکن چونکہ وہ جواب دینے کے قائل نہیں ہیں اس لئے یہ جواب لاجواب رہے گا۔"

سیّد میر قاسم کے شریف النفس ہونے سے کسی کی دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔ صادق قاسم اختلافات کے دنوں شمیم صاحب نے وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق کا ساتھ دیکر سیّد میر قاسم پر تحریر و تقریر کے ذریعہ جارحانہ حملے کئے اور جب شمیم اپنے آخری دور میں امریکہ علاج کے لئے جانا چاہتے تھے۔ قاسم صاحب نے ان کا امریکہ میں اپنے بیٹے ڈاکٹر سیّد سجاد کے ہاں نہ صرف قیام و طعام کا بندوبست کرایا۔ بلکہ امریکہ کے مختلف صوبوں میں

رہنے والے اپنے ہندوستانی اور کشمیری دوستوں کے نام مکتوبات لکھ کر اُن کی مالی امداد کرائی۔ شمیم کی دور رس نگاہوں نے برسوں قبل سیّد میر قاسم کی اس خوبی کو بھانپ لیا تھا۔ جب ہی اُن کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

" بعض شخصیتیں اپنی ظاہری آب و تاب اور چمک دمک سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ اُن کی چھاؤں میں بیٹھ کر کچھ دیر کیلئے تھکن کا احساس تو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ اس کے برعکس کچھ شخصیتوں کی لو بہت دھیمی اور ہلکی ہوتی ہے جو چکا چوند پیدا نہیں کرتیں بلکہ ایک سکون آمیز روشنی کا اہتمام کرتی ہیں۔ سیّد میر قاسم کی شخصیت اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔"

خواجہ غلام محی الدین قرہ کی سیاست شمیم کی نظر میں جلد بازی کی سیاست ہے اس کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

" شیکسپیر نے ایک جگہ لکھا ہے وہی آدمی کامیابی کی چوٹی پر پہنچ سکتا ہے جو پہلا قدم آہستہ اُٹھائے۔ قرہ صاحب کی شان نزول اس کے بالکل متضاد رہی — قرہ صاحب کا المیہ چھوٹے پیمانے پر وہی ہے جو روس کے ٹراٹسکی اور ہندوستان کے سبھاش چندر بوس کا تھا۔ اس کی چمک دمک فرصت سے زیادہ اذیّت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ روشنی کچھ ایسے انداز رکھتی ہے کہ اسے جیتے رکھنے کی بجائے کچھ لوگ بجھانے پر مائل ہوتے ہیں۔"

ان کتابوں میں تتلیاں رکھ جا
کچھ تو اپنی نشانیاں رکھ جا

شمیم احمد شمیم کی کتاب زیست نامرادیوں اور کامرانیوں کا مجموعہ ہے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ انہوں نے بڑی تیز گامی سے ریاست کے وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق کے رفقاء سے بخشی مخالفت کو اپنا سرمایہ بنا کر یارانہ گانٹھ لیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۶۷ء کے اسمبلی انتخابات میں خلاف دستور نہ اُن کے تائید کنندگان اغوا کئے گئے اور نہ پیشگی ووٹوں سے بھرے صندوق اُن کے حلقہ انتخاب میں لائے گئے۔ ایک سوچے سمجھے آزادانہ ماحول میں اس حلقہ انتخاب کے ووٹروں نے اپنے ووٹ سے ان کے مدمقابل منجھے ہوئے سیاسی مہروں جن میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ریاستی رہنما جناب عبدالستار رنجور، نیشنل کانفرنس کے علاقائی لیڈر جناب عبدالمجید بانڈے اور کانگرس کے خواجہ غلام حسن خان کو پس پشت چھوڑ کر شمیم کو منتخب کیا۔ اس تبدیلی کو حلقہ شوپیاں کے باشعور عوام کی فرسودہ قیادت سے منہ موڑنے کا نام دیا گیا۔

شمیم کی اس پہلی کامیابی نے اُس کے جوان حوصلوں اور اُمنگوں کو تقویت بخشی۔ بحیثیت آزاد ممبر کے ایوان اسمبلی میں نہ صرف اپنے حلقہ انتخاب کی بھرپور ترجمانی کی بلکہ اُن دوسرے ممبروں سے نوک جھونک اور تیکھے فقرے قانون سازیہ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

ریاستی سیاست کے بابا آدم جناب شیخ محمد عبداللہ جو دسمبر ۱۹۶۷ء میں رہا کئے گئے، سے شمیم نے راہ و رسم پیدا کی۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں شیخ صاحب نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے مختلف الخیال افراد اور جماعتوں کے نظریوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے پیپلز کنونشن نام

کا فورم تشکیل دیا جس کا اجلاس مجاہد منزل سرینگر میں ہوا۔ شری جے پرکاش
نارائن سمیت کئی اور سرکردہ افراد نے اس میں شرکت کی۔ شمیم نے کنونشن کے
دوران شیخ صاحب اور محاذ رائے شماری کے دوسرے سرکردہ لیڈروں کی قربت
اور اعتماد حاصل کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ کنونشن میں
شامل ہونیوالے دانشوروں ، مفکروں اور سیاست دانوں کے انتخاب میں
ان کی پسند کا خاصا عمل دخل رہا۔ ان کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے
کہ فروری ۱۹۶۹ء میں پیوپلز کنونشن کی سٹیرنگ کمیٹی کی میٹنگ جموں میں
منعقد ہونی قرار پائی لیکن شمیم کے پاکستان جانے کی بنا پر اور اُن کی غیر موجودگی
کے احساس نے منتظمین کو میٹنگ مارچ ۱۹۶۹ء تک ملتوی کرنے پر مجبور کیا۔
یہ اور بات ہے کہ پیوپلز کنونشن جس طمطراق سے وجود میں آئی وہ اپنے انجام
کے لحاظ سے خوشگوار اثرات چھوڑ کر اختتام پذیر نہیں ہوئی۔ کنونشن میں
پڑھنے والے پیپروں کے بارے میں باور کرایا گیا تھا کہ وہ رائے عامہ کے لئے
مشتہر کئے جائیں گے بعد میں یہ کہکر اس ارادے کو ترک کیا گیا کہ بیشتر پیپر
آٹھویں جماعت کے طلباء کے جواب مضمون سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے
جناب سیف الدین قاری نے کنونشن میں لفظ سیکولر پر بحث و تمحیص
کے دوران اس کی تشریح میں دلائل دیتے ہوئے اعتراض پیش کیا اور اسے
حذف کرنے کا مطالبہ کیا۔ کنونشن کے اختتام پر اس الزام میں کہ سیف الدین
قاری سیکولرازم کے مخالف ہیں نظر بند کئے گئے۔ اس گرفتاری پر پیوپلز
کنونشن کے جملہ ممبران نے اپنے لب سی لئے اور شہر خموشاں کی خموشی سادھ لی

جناب بخشی غلام محمد اور جناب غلام نبی خیال نے اپنے پیپروں میں ہند سے کئے گئے الحاق کی توثیق پر زور دیا جس پران دونوں کی پٹائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس طرح پیوپلز کنونشن اپنی افادیت کھو چکی اور خرافات اور لغویات میں اُلجھ کر رہ گئی۔

شمیم احمد شمیم کے کارناموں میں یہ ایک اہم کارنامہ ہے جب سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں جناب سیّد میر قاسم اور خواجہ غلام محمد صادق کے درمیان نظریاتی اختلافات عروج پر پہنچے۔ سیّد میر قاسم صدر کانگریس کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ شمیم نے منصوبہ بند پروگرام کے تحت صادق صاحب کی حمایت کرتے ہوئے تحریر و تقریر کے ذریعہ نہ صرف قاسم صاحب بلکہ اُن کے عزیز واقارب کو بھی ہدف ملامت بنانے سے گریز نہیں کیا، لیکن جلد ہی ان دونوں لیڈروں پر فہمیدگی غالب آگئی اور مسز گاندھی کے بیچ بچاؤ اور مثبت رول نے انہیں یکجا کیا۔ شمیم اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے رہ گئے۔

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۱۳ جنوری ۱۹۷۱ء کو جموں و کشمیر محاذ رائے شماری پر غیر قانونی سرگرمیوں کے ایکٹ کے تحت پابندی عاید کی۔ جناب شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ دہلی میں نظر بند کئے گئے۔

فروری ۱۹۷۱ء میں وسط المدتی پارلیمانی انتخابات ہوئے۔ شمیم صاحب نے شیخ صاحب کی حمایت سے سرینگر کی پارلیمانی نشست جیت کر بخشی غلام محمد کو شکست دی۔ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے کے کچھ عرصہ بعد شمیم نے طالع آزمائی اور سیاسی یتیموں کی پناہ گاہ کے طور پر پیوپلز فرنٹ نام کی جماعت

قائم کی جو عوام میں مقبول عام کی سند حاصل نہ کر سکی البتہ اس نے شیخ محمد عبداللہ جیسے جہاں دیدہ سیاست دان کو چونکا دینے کے علاوہ شک و شبہات کا بیشمار مواد فراہم کیا۔ ایک ایسا شخص جو ایک لیڈر ایک تنظیم اور ایک پروگرام کے سوا کچھ سُننے کا عادی نہ تھا، جس کی ادنیٰ اسی توجہ، عنایت و شفقت نے شمیم کو گمنامی سے نکالکر بام عروج کے زینہ تک پہنچایا کے تیور بگڑانے میں دیر نہ لگی۔ لیکن حالات کی نزاکت کے پیش نظر خاموش زیر لب مُسکراتا رہا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو خواجہ غلام محمد صادق انتقال کر گئے اور سید میر قاسم ریاست کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ۸ جنوری ۱۹۷۱ء کو شیخ صاحب پر عاید شدہ پابندیاں ہٹائی گئیں اور پھر فروری ۱۹۷۲ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ماقبل ہونے والے انتخابات سے یہ بہت زیادہ آزادانہ ماحول میں کئے گئے اس میں کانگرس پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں مرزا محمد افضل بیگ نے شیخ صاحب کے بدلتے سیاسی موقف کی اطلاع سید میر قاسم کو دی اس طرح کشمیر اکارڈ کیلئے راہ ہموار ہوئی۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں مرکزی حکومت اور شیخ محمد عبداللہ کے مابین جیگ پارتھا سارتھی گفت و شنید کا آغاز ہوا اور پھر ۱۹۷۴ء کے وسط میں شیخ صاحب نے اپنے نئے مؤقف کی وضاحت کرتے کہا۔

"۱۹۵۳ء کے معاہدے کو بحال کرنا ضروری ہے مسئلہ کشمیر ہندوستان کا داخلی معاملہ ہے۔"

۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کو شیخ صاحب نے دوبارہ اقتدار سنبھالا اور اس

کے ساتھ ہی راشن پر دی جانے والی سبسیڈی کو رفتہ رفتہ مکمل طور ختم کرنیکا اعلان کیا جس سے عوامی حلقوں میں بے چینی اور ناراضگی پھیلی جس کا برملا مظاہرہ بھی کیا گیا۔ دہلی میں وزیر اعظم مسز گاندھی کے ایماء پر آئین ہند کے دفعہ ۴۲ کے آرٹیکل ۸۲ کی ترمیمی بل پاس کی گئی جس کے تحت پارلیمنٹ کی مدت میں ایک سال کی توسیع کی گئی اور فروری ۱۹۷۷ء میں پارلیمنٹ کے نئے انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ اس دوران شمیم احمد شمیم بظاہر شیخ کے قریب تر نظر آتے رہے لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ یہ اُن کے درمیان اچھے تعلقات کے زوال کا آخری دور تھا اور وہ رہا سہا اعتماد بہت پہلے کھو چکے تھے باقی جو کچھ تھا وہ حجاب ہی حجاب تھا سرینگر کی پارلیمانی نشست نے ان پردوں کو بھی ہٹا دیا۔ پارلیمنٹ میں نیشنل کانفرنس کے اُمیدواروں کے انتخاب کے لئے پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کا جموں میں اجلاس ہوا۔ بقول شمیم احمد شمیم شیخ صاحب نے مجھے کہا "یہاں کیوں وقت ضایع کر رہے ہو اپنے حلقۂ انتخاب میں سرگرم ہو جاؤ"۔ لیکن میں نے بہتر یہی سمجھا کہ ورکنگ کمیٹی کی نامزدگی کے بعد ہی سرینگر جاؤں۔ ورکنگ کمیٹی میں اس ضمن میں خواجہ غلام محی الدین شاہ، خواجہ غلام محمد بٹ (بسنت باغ) خواجہ مبارک شاہ (بارہمولہ) اور بیگم شیخ محمد عبداللہ کے نام سرینگر کی نشست کیلئے اکثر ممبروں نے پیش کئے۔ شمیم احمد شمیم کا نام بسنت سنگھ پنچھی نے پیش کیا، تائید کسی نے نہیں کی۔ شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں اشاروں کنایوں میں شمیم کو رد نہیں کیا جب کچھ اور لیڈروں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو انہوں نے شمیم کی واضح الفاظ میں مخالفت کرتے کہا کہ وہ نیشنل کانفرنس کا بنیادی ممبر ہے

اور نہ اُسے ہماری سیاسی منطق و نظریہ پر اعتقاد ہے اس لئے اپنی سیاسی دوکانداری
چمکانے کیلئے پیپلز فرنٹ کا سائن بورڈ بھی آویزاں کیا ہے نیشنل کانفرنس پر
یہ ذمہ واری کیسے عائد ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو اپنا نمائندہ چنے جس کی
رعایتاً اس جماعت نے ماضی میں حمایت کی تھی۔ ہمیں سختی سے جمہوری اصولوں
کا پابند ہونا چاہیئے۔ ان کی تائید کئی دوسرے ممبروں نے بھی کی۔ نتیجہ کے
کے طور پر بیگم شیخ محمد عبداللہ اس نشست کیلئے این سی کی اُمیدوار قرار پائیں
ملکی سطح پر مجموعی طور اس انتخاب میں مسز گاندھی سمیت کانگریس جماعت بُری
طرح ہار گئی اور جنتا پارٹی جو مختلف جماعتوں کا مجموعہ تھی، برسراقتدار آئی۔
نیشنل کانفرنس کے اس فیصلہ نے شمیم احمد شمیم کو دودھ کی مکھی کی
طرح الگ کر کے دُور پھینکا اور وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے۔ ۱۹۷۷ء میں
ہی جنتا پارٹی نے اُن تمام ریاستوں میں جہاں کانگریسی وزارتیں قائم تھیں دوبارہ
انتخاب کرانے کا اعلان کیا۔ ان ریاستوں میں ہماری ریاست بھی شامل تھی البتہ
سیاسی تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے اسے شیخ وزارت کہا جاتا تھا۔ ۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء
کو ریاست کے گورنر لکشمی کانت جھا نے ریاستی اسمبلی توڑنے اور گورنر راج نافذ
ہونے کا اعلان کیا۔ وہ لوگ جو شیخ محمد عبداللہ کی سیاست، راشن کی سبسڈی
ختم کرنے کے اعلان اور سابقہ رنجشوں سے خار کھا بیٹھے تھے متحد ہو کر سڑکوں
پر نکل آئے۔ برہنہ ناچ ناچا گیا۔ زبردست مظاہرے شروع ہوئے۔ ان زوردار
مظاہروں کی اطلاع جب دہلی میں حکمرانوں کو ملی فرطِ مسرت سے سرشار ہوئے
اور اسے جنتا لہر کا نام دیکر جوق در جوق صف بستہ گراں آنے لگے۔ انہی دنوں شیخ صاحب

پر دل کا دورہ پڑا جس کو جنتائی لیڈروں نے غیبی امداد کا نام دیا۔ مولانا محمد سعید مسعودی کی قیادت میں پارٹی دفتر قایم کرکے انتخاب جیتنے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ شری جگ جیون رام، ٹھاکر چرن سنگھ اور وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی انتخابی مہم کو آرنج دینے بہ نفس نفیس یہاں تشریف لائے۔ مولانا محمد فاروق نے مسٹر ڈیسائی کے اعزاز میں میر واعظ منزل میں دعوت طعام کا اہتمام کیا جہاں خواتین کی ایک ٹولی نے "پاکستان ٹک راجہ ہے آؤ" کا ترانہ گایا۔ دوران گفتگو مولوی فاروق نے مسٹر ڈیسائی سے کہا —— "اس وقت جس جگہ آپ تشریف فرما ہیں ۱۹۴۴ء میں جب قائد اعظم جناح یہاں تشریف لائے تھے ٹھیک اسی جگہ بیٹھے تھے"۔ جگ جیون رام نے شیخ صاحب کی بیماری پر طنز کرتے کہا۔ "نیشنل کانفرنس ایک فرد کا نام ہے جسے اب آرام کی ضرورت ہے"۔ حالانکہ اس سے تھوڑے ہی عرصہ قبل جگ جیون رام بھی خود دل کے دورے سے گذرے تھے۔ حضوری باغ کے انتخابی جلسہ میں چرن سنگھ نے مولانا مسعودی سے اس بات کی اجازت چاہی کہ بحیثیت وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر اُن کے نام کا پیشگی اعلان کیا جائے۔ وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی نے اپنے بیانات میں بار بار دہرایا کہ "نیشنل کانفرنس ریاست میں ہمارا ایجنٹ بنکر کام کرنا چاہتی ہے جو ہمیں منظور نہیں"۔

غرض اس موقع پر ہر وہ شخص جس کو شیخ محمد عبداللہ سے خدا لگی بیر تھا جنتائی کیمپ میں گھس کر قائد کہلانے لگا۔ بھلا اس سنہری موقعے کو شمیم کیسے چھوڑتے؟ انہیں جنتا پارٹی نے شوپیان سے اپنا اُمیدوار نامزد کیا۔ اور مرار جی ڈیسائی

ان کی انتخابی مہم کو آگے بڑھانے کی غرض سے ہیلی کاپٹر میں کشاں کشاں شوپیاں پہنچے جہاں انہوں نے اپنی مختصر تقریر میں اور باتوں کے علاوہ اس نقطے پر زور دیا: "اگر کسی جگہ ہمارا نامزد اُمیدوار لوگوں کے معیار پر پورا نہ اُترے تو وہ اپنی پسند کے اُمیدوار کو کامیاب بنائیں ہم اُس کے ذریعہ بھی لوگوں کی خدمت کریں گے۔" مرارجی ڈیسائی کے اس جملے کو سیاسی مبصروں نے شمیم کیلئے بدشگون تصور کیا۔ انتخابات کے نتائج میں جنتا پارٹی کو بے شمار دولت لٹانے کے عوض میں صرف دو نشستیں حاصل ہوئیں۔ اس عبرتناک شکست سے گھبرا کر وادی بھر کے وہ تمام لوگ جو اس جماعت سے منسلک ہوئے تھے جنتائی جہاز سے لمبی چھلانگیں لگا کر برسوں منہ چھپاتے رہے سیاسی قسم کے مذہبی پیشواؤں نے مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر شیخ صاحب کو یقین دلایا کہ وہ نہ آپکی سیاست کے مخالف ہیں اور نہ نظریات سے اختلاف رکھتے ہیں۔ معاملہ صرف راشن کی ربسیڈی کا ہے اب آپ جیت گئے کوئی مضائقہ نہیں راشن بھی مہنگے داموں خرید لیں گے۔ انتخابی نتائج کے بعد جشن فتح کے نام پر ہلڑ بازی کا بے مثال بازار گرم کیا گیا چونکہ شمیم احمد شمیم جنتا پارٹی کے شہ سواروں میں شامل تھے اُن کے آفس پر بھی دو بار پتھراؤ کیا گیا۔

انتخابات میں شکست کھانے کے بعد شمیم بالکل تنہا رہے نہ دوستوں کی محفلیں نہ ہمدردوں اور غمگساروں کا ہجوم پر انہوں نے حوصلہ نہ ہارا بلکہ قلم کے جوہر دکھا کر اپنی کھوئی ہوئی ساخت بحال کرنے میں جُٹ گئے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۱۹۷۹ء میں وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا

ہوگئے۔ انہوں نے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی سے خواہش ظاہر کی چونکہ میرے پاس علاج و معالجہ کیلئے وسیع ذرایع نہیں اسلئے مجھے لنڈن کے ہندوستانی سفارتخانہ میں فسٹ سیکرٹری کے عہدے پر تعینات کیا جائے تاکہ میں جدید ترین طبی امداد سے مستفید ہو سکوں۔ کچھ عرصہ بعد مرارجی ڈیسائی نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے ساری خط و کتابت شایع کرائی۔

جسے لے گئی ابھی ہوا ‌ ‌ ‌ وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا ‌ ‌ ‌ کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

شمیم احمد شمیم اپنے عہد شباب میں بڑے ہی رنگین مزاج تھے انہوں نے اپنے نام آئے ہوئے حسیناؤں کے خطوط اور تصویر بتاں اپنے ایک لنگوٹیا دوست کے پاس امانتاً رکھے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے ضائع کئے جا چکے ہیں۔

شمیم بادہ کشی کے عادی نہ ہونے کے باوجود مے خوار تھے۔ تاڑی چھنگ رکشی۔ دیسی شراب۔ بیر اور غالباً اعلیٰ درجے کی شاذ ہی کوئی ایسی شراب ہو جس کی لذت سے وہ ناآشنا رہے ہوں لیکن رند ایسا کہ بند بوتلوں کے سمندر میں کبھی نہیں ڈوبے۔ شراب پی کر بہکنے کے بجائے سنجیدہ ہونا مے کشوں میں ان کی شناخت تھی۔

مذہب کے معاملے میں بظاہر زیادہ سنجیدہ نظر نہیں آتے تھے وہ اکثر و بیشتر اس موضوع کو گھریلو مسئلہ کہکر ٹالتے تھے۔ مارکسزم اور اشتراکیت سے بڑی دلچسپی دکھاتے تھے اور کبھی کبھی مارکسی لب و لہجہ میں خدا والوں کا مذاق اُڑانا اپنا پیدایشی حق سمجھتے تھے۔ ذبح کے معاملے میں حلال اور جھٹکے میں

انہیں کوئی تمیز نہیں تھی بہ جموں کے چھلکے تندوری مرغوں کے رسیا، پانپور کے ہندو نانوائی کے قلوچوں کے متوالے تھے۔ کافی ہاوس میں آدھا کپ کافی پی کر اس میں مکھی ڈبو کر نیا کپ منگوانا شمیم کے مذاق میں شامل تھا۔

لیکن اس کے باوجود یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُن کا یہ انداز سوسائیٹی میں پنپنے کا اپنا ڈھنگ تھا۔ بادی النظر سے اگر دیکھا جائے تو وہ پکے مرزائی کوالٹی کے مسلمان تھے اور مرزا صاحب سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ مذہبی رواداری، مختلف فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان یک جہتی اور مساوات کے زبردست حامی تھے۔ زندگی کے آخری ایّام میں نہ صرف پیروں فقیروں کی صحبت میں رہتے تھے بلکہ مزاروں، آستانوں، خانقاہوں پر نذرونیاز چڑھاتے اور اپنی شفایابی کیلئے ختمات کی مجالس بھی منعقد کراتے رہے۔

اس موقع پر شمیم احمد شمیم سے وابستہ چند واقعات کی یاد تازہ کرنا آئینِ دلبری اور دوستداری کا تقاضہ ہے۔

۱۹۶۷ء میں کشمیری پنڈتوں نے پرمیشوری نام کی ایک ہندو لڑکی کے تبدیلِ مذہب اور مسلمان لڑکے سے آنکھ لڑانے اور بعد میں شادی کرنے پر زوردار ایجی ٹیشن شروع کی۔ ان دنوں شمیم صاحب ریاستی قانون سازیہ کے ممبر تھے۔ پرمیشوری جو بعد ازاں پروین اختر بنی کے بارے میں ایجی ٹیشن کے دوران یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ وہ مارے خوف کے اپنے خاوند کے ساتھ سرحد پار کر کے پاکستان چلی گئی ہے۔ چنانچہ پروین اختر کے کئی ہمدردوں نے اس افواہ کی تردید کی خاطر جناب عزیز کاشمیری (مدیر "روشنی") خواجہ ثناءاللہ بٹ

(مدیر "آفتاب") خواجہ غلام رسول عارف (مدیر "ہمدرد") اور مجھے مفتی بشیر الدین صاحب
کے دولتخانہ پر جا کر اس خاتون سے ملاقات کا بندوبست کرا کے یہ ثبوت پیش کیا
کہ افواہ غلط ہے۔ مقامی اخبارات میں تردیدی خبر شایع ہونے ہی شمیم احمد شمیم کو
ہماری ملاقات کا سراغ مل گیا۔ انہوں نے خواجہ غلام رسول عارف اور مجھ سے پروین
اختر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم دونوں نے وقت مقرر کر کے مفتی بشیر الدین صاحب
کی وساطت سے اُن ہی کے دولت خانہ واقع دانہ پورہ سرینگر میں اس کا انتظام
کرایا۔ یہاں یہ کہنا بعید از معلومات نہ ہوگا کہ مفتی بشیر الدین صاحب کے ہاتھوں
ہی پریشوری مشرف بہ اسلام ہوئی اور اُس کا نکاح بھی مفتی صاحب نے ہی
پڑھا۔ غرض وہیں پروین اختر سے شمیم احمد شمیم کو ہماری موجودگی میں بات چیت
کرنے کا موقع ملا۔ جب شمیم نے اُس سے مسلمان بننے کا سبب دریافت کیا
تو وہ کہنے لگی میں نے جامع مسجد میں ایمان صاحب (امام صاحب) کو نماز پڑھاتے
دیکھا۔ مجھے یہ طریقۂ عبادت خوب بھایا۔ اور میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی
کہ میں مسلمان بنوں۔ شمیم نے فوراً لقمہ دیتے ہوئے اسکا جملہ یہ کہکر پورا کیا یعنی
اس سے قبل ہی آپ نے ایک عدد مسلمان لڑکے کی ضرورت محسوس کی تھی اور
آپ کی اس ضرورت نے پورے ہندوستان کو ہلا کے چھوڑا۔ شمیم کے طنز کو وہ
بالکل نہیں سمجھی۔ شمیم صاحب نے وکیلانہ انداز میں سوال کیا۔ اس وقت آپکی
عمر کیا ہوگی؟ میری جنم پتری کے مطابق بائیس سال۔ تو ٹھیک ہے آپ نے
اپنا شریک حیات چن لیا۔ اسی نوعیت کے چند اور سوالات کے بعد جب ہم مفتی
صاحب کے دولت خانے سے باہر نکلے کرفیو کے اوقات میں نرمی کا وقفہ ختم ہو چکا

تھا۔ زینہ کدل پہنچ کر شمیم نے ہم دونوں سے استدعا کی آپ اس انٹرویو کو نہ چھاپیں کیونکہ میں اس پس منظر میں ایوان اسمبلی میں تقریر کروں گا۔ اس عہد و پیمان کے بعد اگلے دن شمیم احمد شمیم نے ایوان اسمبلی میں اس پروپیگنڈے کا موثر جواب دیا۔ جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ اغوا کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں دیگر نقطوں کو ابھارتے ہوئے کہا کہ ایک بائیس سالہ لڑکی شمس کو قانوناً اور اخلاقی طور اپنا شریک حیات چننے کا پورا پورا حق ہے اس نے اسی حق کا استعمال کیا ہے۔ وہ پاکستان نہیں بھاگی ہے بلکہ میرے علم و دانست کے مطابق سرینگر میں اپنے خاوند کے ساتھ قیام پذیر ہے اور ان لوگوں کو جو ایک بالغ لڑکی کی معاملہ کو اپنے مقاصد و مفادات کے لئے فرقہ وارانہ رنگ دیکر استعمال کر رہے ہیں۔ اس نازیبا حرکت سے باز آنا چاہیئے۔ ایوان اسمبلی میں سناٹا چھا گیا۔ کشمیری پنڈتوں کو شمیم صاحب سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ الٹا انہیں کو آڑے ہاتھوں لیں گے۔ ان کی نظر میں وہ ایک شاطر اور موقع پرست نوجوان تھا جو وقتی بہاؤ میں بہہ کر ان کا ساتھ دیکر سستی شہرت حاصل کرنے کے اس موقعہ کو کسی صورت میں ضایع نہیں ہونے دیگا لیکن شمیم صاحب کی حق گوئی نے کھوٹے کو کھرا کہنے سے انکار کیا۔ ان کی نگاہ میں شمیم نہ سیکولر دل و دماغ کے مالک رہے اور نہ ان میں قوم پرستی کی کوئی رمق باقی رہی۔ بلکہ وہ ان کی نظر میں کٹر فرقہ پرست اور ایک جوشیلا مسلمان نوجوان بن کر رہ گیا۔ حالانکہ پہلے تھوڑی وہ انہیں قوم پرستی کا تابناک ستارہ کہا کرتے تھے۔ جوں جوں مطلع صاف ہوتا گیا یہ کیفیت باقی نہ رہی۔ دراصل یہ ایک جذباتی اور عبوری دور تھا جو نہی کشمیری پنڈتوں نے حقیقت پسندی

کو اپنایا، شمیم کی سیکولر شخصیت اور قوم پرستی کا تصور پہلے سے کہیں زیادہ اُن کے سامنے اُبھر کر آیا۔

خواجہ غلام محمد صادق کے دورِ وزارت میں کانگریس ریاست جموں و کشمیر میں درآمد کی گئی اور اس کے پہلے صدر جناب سیّد میر قاسم چُنے گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وزیرِ اعظم مسز گاندھی سرینگر تشریف لے آئیں تو اُنہوں نے بین کورٹ ہال میں ایک پُر ہجوم پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اس امر کا انکشاف کیا کہ دراصل یہ میری دیرینہ خواہش تھی کہ ریاست جموں و کشمیر کو سیاسی سطح پر ملک کے دوسرے حصوں کے برابر لایا جائے اور اس ریاست میں بھی کانگریس کی تنظیم قائم کی جائے لیکن میرے والد پنڈت جواہر لال نہرو میری اس خواہش میں ہمیشہ سدِّ راہ بنے۔ اسی پریس کانفرنس میں مسز گاندھی نے اخبار نویسوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے مکمل الحاق کی وکالت کرتے ہوئے رائے شماری کو خارج از امکان قرار دیا۔ ریاست میں کانگریس کے رول کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ اب وہ دن دور نہیں جب "نیا کشمیر" کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ "نیا کشمیر" کا تذکرہ آتے ہی ایڈیٹر "سلسبیل" مسٹر طاہر مضطر نے بڑے ہی معنی خیز انداز میں سوال کیا۔ "نیا کشمیر" نیشنل کانفرنس کا انتظامی لائحۂ عمل اور منشور ہے جو اس جماعت نے ۱۹۴۴ء میں اپنے سیاسی نظریات عندیہ اور عقیدے کے مطابق مہاراجہ ہری سنگھ کے سامنے پیش کیا تھا۔ کیا واقعی آپ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتی ہیں۔ اس خلافِ توقع سوال پر مسز گاندھی نے بڑے حوصلے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ہاں یہاں کانگریس "نیا کشمیر" کے

پروگرام کو آگے بڑھائیگی۔ مسٹر طاہر مضطر نے اپنے سوال کی وضاحت میں ضمنی سوال کرتے ہوئے دریافت کیا۔ جو کچھ "نیا کشمیر" کے منصوبے میں لکھا ہے کیا کانگریس اس کو روبعمل لائے گی۔ اس مرتبہ مسز گاندھی کچھ جھینپ سی گئی اور انہیں یہ اخذ کرنے میں دیر نہ لگی کہ اس تکرار کے پس منظر میں ضرور کوئی راز پنہاں ہے مسز گاندھی کے ساتھ ریاستی ہوم منسٹر درگا پرشاد در بیٹھے تھے۔ وہ غضبناک ہو کر طاہر مضطر کو دیکھنے لگے۔ عین ممکن تھا کہ وہ کہہ اٹھتے۔ تم یہاں کیسے آئے ہو نکل جاؤ یہاں سے' اور ایسا کرنا ڈی، پی، در کی آمرانہ طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا شمیم احمد شمیم موقعہ کی نزاکت بھانپ گئے۔ انہوں نے مداخلت کرتے مسز گاندھی کی جانب سے کہا۔ یقیناً کانگریس پارٹی ریاست میں "نیا کشمیر" کے اقتصادی منصوبے کو روبعمل لاکے رہے گی۔ ڈی، پی، در کی جان میں جان آگئی۔ قہر آلود چہرے پر مسکراہٹ پھیلی اور مسز گاندھی چہروں کی کتاب پڑھکر دل کی کیفیت سمجھنے میں یدطولی رکھتی تھیں خوب مسرور ہوئیں اور شمیم سے کہا۔ "آپ پارلیمنٹ میں کیوں نہیں آتے؟" شمیم نے جواب دیتے کہا۔ "اگر آپ آنے دیں تو" مسز گاندھی یہ زبان خوب جانتی تھیں۔ فوراً کہا الیکشن لڑ کر آئیے ہم آپ کا وہاں استقبال کریں گے بس یہیں سے شمیم کے دل میں پارلیمنٹ میں جانے کی خواہش جاگ اٹھی۔

۱۹۷۱ء کے وسط المدتی پارلیمانی انتخابات کے دوران شیخ محمد عبداللہ اور جناب مرزا محمد افضل بیگ کوٹلہ لین دہلی میں نظر بند تھے۔ مگر ان کے سیاسی نظریات اور طرز فکر میں واضح تبدل کے آثار رونما ہوئے تھے۔ وہ سالہا سال کے انتخابات سے کنارہ کشی کی پالیسی ترک کر کے ان میں شریک ہونے کے لئے پرتول

رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں خفیہ طور پر مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ سے صلاح و مشورے بھی شروع کئے۔ ان کی تجویز تھی کہ تجرباتی طور پر مسز مردولا سارا بھائی کو سرینگر کی پارلیمانی نشست سے بطور آزاد امیدوار کے بخشی غلام محمد صاحب کے مقابلے میں کھڑا کر کے ان کی بھرپور حمایت کی جائے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ مولانا مسعودی اور دوسرے رہنماؤں نے جو قید خانوں سے باہر تھے انتخابات میں شرکت کی تجویز کو سراہا۔ البتہ مسز مردولا سارا بھائی کو بطور امیدوار قبول کرنے کی مخالفت کی۔ ان کے عندیہ میں تاریخ کی اس نازک ترین گھڑی میں کسی غیر ریاستی کی حمایت عوامی حلقوں میں شک و شبہات کا باعث ہوتی۔ ان کے مابین یہ ساری بات چیت بڑی رازداری سے دہلی اور سرینگر کے درمیان پیغام رسانوں کے ذریعہ چل رہی تھی۔ اور یہ بات بھی زیر غور تھی کہ کسی ایسے شخص کی تلاش جاری رکھی جائے جو بخشی غلام محمد کے سیاسی اور دیگر ہتھکنڈوں کے سامنے نہ جھکے۔ اس بات کی بوجھ گاندربل میں مولانا محمد سعید مسعودی سے ایک ملاقات کے دوران آئی۔ اسی دوران شمیم احمد شمیم نے کانگریسی امیدوار محمد شفیع قریشی کے مقابلے میں حلقہ انتخاب اننت ناگ سے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کئے تھے لیکن انہیں اپنی کامیابی کے آثار کم ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس حلقہ انتخاب سے زیادہ سے زیادہ امیدوار کھڑے ہو جائیں تاکہ ووٹوں کی تقسیم کی صورت میں شاید ان کے قدم جم جائیں۔ اننت ناگ کے دورے کے بعد جب شمیم احمد شمیم سے میری ملاقات ہوئی تو مایوسی کے آثار ان کے چہرے سے عیاں تھے۔ باتوں باتوں میں میں نے انہیں مشورہ دیا کہ دہلی

جاکر شیخ صاحب سے ملنے میں کیا قباحت ہے ممکن ہے کہ موجودہ حالات میں وہ آپ کی حمایت کرنے کی حامی بھریں۔

چند روز بعد شمیم صاحب دہلی سے جناب شیخ محمد عبداللہ کا ایک مکتوب حلقۂ اننت ناگ کے عوام کے نام لیکر واپس لوٹے اور شیر باغ اسلام آباد کے جلسہ میں اس کی نمائش کرتے کہا کہ مجھے جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ شیخ صاحب کا نام آتے ہی جلسہ گاہ میں محاذ رائے شماری کے حامیوں نے شمیم صاحب کو جھوٹا اور فریبی کہکر زبردست ہنگامہ بپا کیا۔ جلسہ افراتفری کے عالم میں برخاست ہوا۔ لیکن لوگوں کی اس حقارت اور نفرت آمیز مظاہرے میں شمیم صاحب کو اپنی کامیابی کا راز پنہاں نظر آیا۔ انہیں شیخ صاحب کی اہمیت اور اُن پر عوامی اعتماد کا صحیح اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی۔ دوبارہ دہلی گئے، صورتحال سے شیخ صاحب کو روشناس کیا۔ ان کے صلاح و مشورے پر شمیم نے اننت ناگ کے بجائے حلقۂ انتخاب سرینگر سے انتخاب لڑنے کیلئے کاغذات نامزدگی داخل کئے اور اس بات کی تصدیق کیلئے شمیم صاحب کے ہمراہ بیگم شیخ محمد عبداللہ سرینگر تشریف لے آئیں۔ انہوں نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز ۲۱ فروری کو خانیار سے کیا اور اپنی تقریر میں کہا۔

"شیخ صاحب کا فرمان ہے کہ جبر و ظلم اور غنڈہ گردی کے خاتمہ کے لئے شمیم احمد شمیم کو اپنا ووٹ دیکر کامیاب بنائیے۔"

بیگم صاحبہ کے آتے ہی محاذ رائے شماری کی ساری تنظیم شمیم احمد شمیم کی حمایتی اور الیکشن کمپین چلانے کی مشینری میں تبدیل ہوگئی اور مولانا

محمد سعید مسعودی جیسے خرانٹ سیاستدان کو اس مہم جوئی کی دلیل میں یہ کہنا پڑا

" یہ شیخ صاحب کا حکم ہے اگر وہ ہمیں کھمبے کو بھی ووٹ دینے
کے لئے کہیں گے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

غرض اس طرح پارلیمانی حلقۂ انتخاب سرینگر کے گوشہ گوشہ میں شمیم احمد شمیم کا نام گونج اُٹھا۔ اس زوردار مہم کے دوران جہاں لوگوں سے شمیم کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کرنے کی ہدایت و ترغیب کیلئے پبلک جلسوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہوا وہاں ان جلسوں میں بخشی غلام محمد کو استعاروں اور تشبیہوں کی آڑمیں موئے مقدس کا چور کہنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ اس کے جواب میں بخشی غلام محمد نے مہاراج گنج کے جلسہ میں یہی الزام مولانا مسعودی، خواجہ غلام محی الدین قرہ اور مرزا محمد افضل بیگ پر لگایا۔

تو سم نہ رسی کعبہ اے اعرابی
کایں راہ تو روی بہ ترکستان است

غرض اس انتخابی گرماگرمی اور ہنگامہ آرائی کے اختتام پر شمیم احمد شمیم نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ جناب شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی لیفٹننٹ کہلانے کا اعزاز بھی حاصل کر گئے لیکن سلجھے ہوئے پارلیمنٹیرین ثابت نہیں ہوئے کوٹلہ لین کی نظر بندی سے رہائی کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور مولانا محمد سعید مسعودی کے درمیان اختلافات کی خبریں ریاست کے خاور و باختر میں گرم ہوئیں جن کے درست ہونے کی تصدیق گاندربل میں محاذ رائے شماری کے اس جلسہ میں ہوئی جس کی صدارت بہ نفس نفیس جناب شیخ محمد عبداللہ کر رہے تھے اور

پنڈال پر مولانا محمد سعید مسعودی اور شمیم احمد شمیم صاحب تشریف فرما تھے اور جہاں شیخ صاحب کے اشارے پر شمیم نے اپنی تقریر میں مولانا مسعودی کی ذات پر تابڑ توڑ اور ذاتی حملے کئے۔ مولانا مسعودی جب شمیم احمد شمیم کی تقریر کا جواب دینے کھڑے ہوئے تو شیخ صاحب نے انہیں یہ کہہ کر روکا کہ یہ محاذ رائے شماری کا سٹیج ہے اور چونکہ آپ محاذ کے ممبر نہیں ہیں اس لئے اس پلیٹ فارم کو استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔ بادی النظر سے اگر دیکھا جائے تو ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے شمیم احمد شمیم تو درکنار بذات خود شیخ محمد عبداللہ بھی محاذ رائے شماری کے ممبر نہیں تھے۔ اس واقعہ کے چند گھنٹوں بعد شمیم صاحب سے میری ملاقات ریگل چوک میں ہوئی اور کافی ہاؤس میں انہوں نے چٹخارے لے لے کے اپنی ساری تقریر مع منظر کشی کے مجھے سنائی۔ میں نے اشاروں اور کنایوں میں شمیم صاحب کو یہ باور کرانے کی سعی کی کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ قابل تحسین نہیں۔ میری تو شیخ صاحب سے دعا و سلام تک رسائی ہے لیکن وہ جنہیں کبھی آپ سے بھی زیادہ ان سے قربت رہی ہے اُن کا تجربہ ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب رینگ ماسٹروں کو چٹکی بجا کر الگ کرنے میں لاثانی ہیں۔ جن میں میرواعظ کشمیر مولوی محمد یوسف شاہ، پنڈت پریم ناتھ بزاز، چودھری غلام عباس خان اور کئی دوسروں کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن شمیم صاحب اپنی کامرانی پر سرشار تھے اور غالباً انہیں میرا طرز بیان کچھ اچھا نہیں لگا۔ غرض یہ وہ دور تھا جب شیخ صاحب کی قربت اور دستِ شفقت نے شمیم صاحب کے اُفق پرواز کو لامحدود کر دیا تھا۔

خواجہ غلام محمد صادق کے دور حکومت میں شیخ صاحب کو دوبارہ قومی سیاست

میں لانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ لیکن اس کا سہرا جناب سید میر قاسم کے سر ہے جنہوں نے شیخ صاحب کیلئے وزارت عظمیٰ کی نشست خالی کی۔ اس طرح شمیم احمد شمیم نے بھی حتی المقدور وزیر اعظم مسز گاندھی اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان حائل دوری کے پردوں کو سرکانے میں خاصا کردار ادا کیا۔

شیخ صاحب کے دوبارہ برسرِ اقتدار آتے ہی ہندوستان کے تقریباً جملہ اپوزیشن لیڈروں نے اپنی سیاسی دُکانداری کو مندگی سے بچانے کے لئے اُن کے خلاف پروپگنڈے کو آنچ دینے کی مہم میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی دوڑ شروع کی۔ چنانچہ مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے شیخ صاحب کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ انہوں نے جو منقولہ و غیر منقولہ جائداد بنائی ہے اور بے پناہ دولت اکٹھا کی ہے اُس کا محاسبہ کیا جائے۔ خواہاں خواہاں اس مطالبے نے شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کو چونکا دیا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس کا عوامی سطح پر جواب دیا جائے۔ لال چوک سرینگر میں ایک عوامی اجتماع میں جو شیخ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا، مرزا محمد افضل بیگ نے اپنی اور شیخ صاحب کی جائداد کے ضمن میں جو کچھ کہا اُس میں تخمینہ سے کہیں زیادہ انکساری اور درگذر کا پہلو نمایاں تھا اور پھر شمیم احمد شمیم نے اسی موضوع پر مسٹر اٹل بہاری باجپائی کو للکارتے ہوئے سیاسی طالع آزما کہہ کر اُنہیں آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے چیلنج کیا "جس دولت کا حساب طلب کیا جارہا ہے وہ اُس سرمایہ کی نسبت صفر کے برابر ہے جس کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں وہ لوگ یہ کیسے بھول رہے ہیں کہ اُن کے سرمایہ میں ریاست جموں و کشمیر کے ساٹھ لاکھ عوام کی

جائیدادیں بھی شامل ہیں۔ ان کے سرمایہ میں اس ریاست کی سرسبز و شاداب وادیاں، فلک بوس پہاڑ، ترنم ریز ندی نالے، لہلہاتے ہوئے کھیت اور گھنے جنگلات بھی شامل ہیں۔ اگر شیخ محمد عبداللہ سے حساب لینا ہی مطلوب ہے تو یہاں تشریف لائیے اور ہم پورا حساب چکا دیں گے۔" شمیم احمد شمیم کی طویل اور لاجواب تقریر کو سُن کر دوست دشمن ہر ایک نے داد دی اور اس طرح شیخ صاحب کے خلاف ایک منظم کردار کشی کی لفاظی جنگ ہمیشہ کیلئے ختم ہوئی، لیکن یہی وہ تقریر تھی جس نے شیخ صاحب کے دوسرے قریبی ساتھیوں کو یہ سوچنے پر اُکسایا کہ اگر شمیم نے در مدح شیخ محمد عبداللہ ایسی ہی دو چار اور تقریریں کیں تو وہ ساری تنظیم پر چھا جائیں گے! انہوں نے بدگمانیوں، اندیشوں اور وسوسوں کی گنجایش پیدا کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جس کا ایسے موقعوں پر کیا جانا لازمی بنتا ہے۔ حتیٰ کہ شیخ صاحب کے سامنے انہیں کشمیر کا سب سے بڑا مسخرہ باز بتلا کر اُس تقریر کا بار بار حوالہ دیا گیا جو بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے موقع پر شمیم نے مسز گاندھی کو مخاطب کر کے پارلیمنٹ میں کی تھی اور کہا تھا تاریخی شخصیتیں تاریخ لکھواتی ہیں لیکن مسز گاندھی نے اس میں جغرافیائی حدود مرتب کر کے اضافہ کیا، چنانچہ کچھ عرصہ بعد خواجہ غلام محمد شاہ نے سرینگر کی عدالت کے احاطہ میں اس تقریر پر تبصرہ کرتے مجھ سے کہا "تاثیر صاحب آپ آیندہ پھر کبھی شمیم کو ہمارے پلیٹ فارم پر نہیں پائیں گے" اور ایسا ہی ہوا۔

شمیم احمد شمیم کے خلاف جناب شیخ محمد عبداللہ کو بھڑکانے میں یار لوگ کس حد تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جا

سکتا ہے۔ شیخ صاحب نے دوبارہ برسر اقتدار آتے ہی ریاست کی سیاسی تاریخ قلمبند کرانے کیلئے جناب حمید اللہ خان سیکریٹری ایجوکیشن کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے بنیادی ممبروں میں جناب فدا محمد حسنین، شری بلدیو پرشاد شرما، شری رادھا کرشن پارمو، جناب صدر الدین مجاہد، جناب غلام احمد سیکریٹری وزیر اعلیٰ اور میں شامل تھا۔ کمیٹی کی کئی میٹنگیں جموں اور سرینگر میں ہوتی رہیں۔ کچھ عرصہ بعد کمیٹی کے ممبروں میں مفتی جلال الدین صاحب اور شری موتی لال مصری کا اضافہ کیا گیا۔

شیخ صاحب کی خواہش تھی جس قدر جلد ممکن ہو سکے تحریک آزادی کشمیر میں کام کرنے والے زندہ مجاہدین آزادی کا انٹرویو لیا جائے۔ کمیٹی نے دو سال کے طویل غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد نہ صرف پروجیکٹ رپورٹ تیار کی بلکہ متفقہ طور پر یہ بھی طے پایا۔ چونکہ رشید تاثیر تمام ممبران میں کم عمر اور صحافت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے انٹرویو کا کام انہیں سونپا جائے۔ اس طرح جموں سیکرٹریٹ میں میٹنگ کے دوران مجھے اُن لوگوں کی ایک لمبی سی فہرست دی گئی جن کا انٹرویو لینا مقصود تھا۔[1]

---

[1] فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے اعتراض پیش کرتے کہا کہ اس میں نیشنل کانفرنسیوں کے بغیر کسی اور سیاسی جماعت کے لیڈر یا ورکر کا نام نہیں ہے۔ سیاسی تاریخ کا مقصد و مدعا یہ ہوتا ہے کہ ان جماعتوں، گروہوں، پارٹیوں اور افراد کی انفرادی و اجتماعی کوششوں کامرانیوں، ناکامیوں، نظریات، مقاصد کردار سے اخذ نتائج سے عبارت واقعات

میٹنگ روم سے باہر آکر آر، کے، پارمو اور میں اس موضوع پر گفتگو کرتے
جموں ڈاک بنگلہ کے سامنے ٹاپا میں چائے پینے گئے۔ باتوں باتوں میں مسٹر پارمو نے
شمیم احمد شمیم کی بے باکی اور جرأت مندی کا ذکر کرتے کہا۔ اس کمیٹی کے بنیادی
ممبروں کے اسماء گرامی شیخ صاحب نے خود تجویز کر کے مجھے دئے اور میں نے شمیم
صاحب کی فرمائش پر اس میں ان کے نام کا یہ سمجھکر اضافہ کیا کہ اگر میں ایسا نہ کروں
تو وہ شیخ صاحب سے کہکر کمیٹی کے ممبر بن سکتے ہیں۔ میں نے فہرست میں ان کا نام
لکھا ضرور لیکن اس کی اطلاع شیخ صاحب کو بھی دی! انہوں نے فہرست پر شمیم احمد
شمیم کے نام پر خط تنسیخ لگاتے ہوئے مجھے کہا "یہ تو فتنہ ہے اگر مجھے یہ خط مطلوب

(فٹ نوٹ پچھلے صفحہ سے آگے) بغیر کسی لگی لپٹی کے قلمبند کئے جائیں اور مورخ بحیثیت
منصف ہر مجرم کو اس کے جُرم کے انداز ے کے مطابق سزا دیتا ہے اور ہر مستحق کو
بے دریغ اور بلا طرفداری کے انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ اس لحاظ سے کشمیر کی سیاسی
تاریخ قلمبند کرنے والی اس کمیٹی پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ وہ جرأت،
بے خوفی اور دیانت داری کی کسوٹی پر ہر اعلیٰ و ادنیٰ کے کارناموں، اپروچ اور اُفتادِ
طبع کا صحیح جائزہ لیکر اس جانب پیش قدمی کرے۔ جو فہرست پیش کی گئی ہے
وہ سراسر یک طرفہ ہے اس میں نیشنل کانفرنس سے وابستہ افراد کے سوا اور کسی
دوسری جماعت کے لیڈروں اور ورکروں کا نام تک نہیں ہے۔ حالانکہ ۱۹۴۷ء سے
قبل ریاست جموں وکشمیر میں مسلم کانفرنس، یووک سبھا، ہندو سبھا، ڈوگرہ سبھا، رام
راجیہ پارٹی، کمیونسٹ پارٹی، کسان مزدور کانفرنس وغیرہ کے نام کی کئی جماعتیں
اپنے اپنے نظریات کی تبلیغ و توسیع کیلئے سرگرم عمل رہی ہیں۔ میں نے بے ساختہ اور

ہوتا تو کیا اس کا نام میں نے خود نہ لکھا ہوتا" غرضکہ کمیٹی کے کسی ممبروں نے میرے پُر خلوص خیالات کو شیخ صاحب تک گستاخانہ لب و لہجہ قرار دیکر پہنچایا۔ ردّ عمل کے طور پر انہوں نے فریدی ڈیم ہسٹری کمیٹی کی اگلی میٹنگ سے قبل ہی کمیٹی توڑنے کے احکام صادر کئے

اس طرح نہ رہا بانس اور نہ بجی بانسری ــــ!

اس واقعہ کے تقریباً چھ ماہ بعد پارلیمانی انتخابات ہونے والے تھے نیشنل کانفرنس نے سرینگر کی نشست کیلئے بیگم شیخ محمد عبداللہ کو اپنا اُمیدوار چُن کر آر' کے' پار مو کے فتنہ کی تصدیق کی۔

اس طرح شمیم احمد شمیم اور جناب شیخ محمد عبداللہ کے درمیان حدِ فاصل

(فٹ نوٹ پچھلے صفحے سے مسلسل) غیر شعوری طور پر بھی کہا۔ اگر جناب شیخ محمد عبداللہ کی سوانح عمری اور اُس کے پس منظر میں نیشنل کانفرنس کی سیاسی تاریخ قلمبند کرنا مقصود ہے تو اس کیلئے جموں و کشمیر کلچرل اکادمی بہتر ادارہ ہے جہاں ریاست کے اعلیٰ پایہ کے محقق ادیب اور شاعر ادب تخلیق کر دیتے ہیں اور تحقیقی مشاغل میں مصروف ہیں۔ میری بات کاٹتے ہوئے صدر الدین مجاہد نے کہا کیا یہ کم ہے کہ اس فہرست میں دو مسلم کانفرنسیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا جناب شیخ محمد عبداللہ سے کہا جائے اگر ریاست کی سیاسی تاریخ مرتب کرانے کا انہیں واقعی ارادہ ہے تو تاریخی حقیقتوں سے چشم پوشی اور رنجیدہ خاطر ہونے کے بجائے انہیں آئندہ کے مورخوں کیلئے جمع کرنا بیحد سودمند رہیگا۔ آج کی نکتہ چینی اور حرفِ تف ان انگلیوں سے بہت کم ہوگی جو کل اس دور کے سیاستدانوں پر تیروں کیطرح اُٹھینگی۔ میری رائے خاموشی سے سُنی گئی اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے کے بعد میٹنگ اگلے دن پر ملتوی کی گئی۔

کھینچا گیا جس نے ریاستی سیاسی اُفق پر شمیم کی حالت اُس کٹی ہوئی پتنگ کے مانند کر دی جو ہوا کے دوش پر ہچکولے کھاتی ہے شمیم نے اپنے قلم سے ہر وہ تیر شیخ محمد عبداللہ اور ان کی جماعت پر چلایا جو ان کے ترکش میں تھا لیکن ع

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

لاکھوں کے مقابلے میں فردِ واحد کی دوپہر کی جنگ میں شمیم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ جان لیوا عارضہ میں مبتلا ہے۔ انگلینڈ جا کر انہوں نے آنکھ کا آپریشن کرایا اور جب واپس لوٹے تو ٹوٹ چکے تھے۔ دوستوں سے ملنا گھنٹوں پیار و محبت کی باتیں کرنا اور گذرے واقعات کو دہرانے کی عادت تو امریکہ علاج کرانے سے پہلے تک قائم رہی۔

چند دن کے بعد شمیم پھر امریکہ علاج کیلئے گئے۔ واپسی پر اُن کا یہ احساس یقین میں بدلا کہ اب زندگی بس دنوں کی بات ہے اُن کے اعضاء جواب دے چکے تھے میں نے کئی بار ملنے کی سعی کی کامیاب نہ ہوا۔ یکم مئی ۱۹۸۰ء کو میرا ٹی وی پروگرام تھا پروگرام کے اختتام پر مسٹر اشرف ساحل نے شمیم احمد شمیم کی موت کی رنجیدہ خبر سنائی۔ دوڑے اُن کے دولت خانے کی راہ لی۔ لوگ انہیں پرتاپ پارک میں جنازہ پڑھ کر قبرستان کی طرف لے جا رہے تھے اور میں بھی سوگواروں کی صف میں شامل ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

گلشن میں جوشِ گُل تو بگولا ہیں دشت میں   اہلِ جنوں جہاں بھی رہے آن سے رہے

برج پریمی

پریم ناتھ در

میں اُن خوش نصیبوں میں نہیں ہوں جنہیں پریم ناتھ درمرحوم سے ملنے کا موقعہ ملا ہو۔ البتہ انہیں دیکھنے کا، ان کے فن پاروں کا مطالعہ کرنے کی سعادت ضرور حاصل ہوئی ہے۔ وہ کشمیر کے تخلیقی ذہن کے ایک معتبر نمایندہ تھے اور انہوں نے اردو کہانی کے میڈیم سے کشمیری قلم کاروں کی روایات کی توسیع میں نمایاں رول ادا کیا۔ آزادی سے قبل یہ پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در تھے جنہوں نے اردو میں افسانے لکھے اور نہ صرف زبان و بیان کے اعتبار سے بلکہ موضوع اور تکنیک کی تازہ کاری سے اردو کے افسانوی ادب میں اپنا مقام بنایا۔ آج بھلے ہی دنیا ان فن کاروں کو فراموش کر چکی ہو لیکن اردو افسانے کی کوئی تاریخ ان کا ذکر کئے بغیر نامکمل رہے گی۔

پریم ناتھ در کو میں نے صرف دو بار دیکھا — پہلی بار کہانی کار پریم ناتھ در کو ایک ادبی اجتماع میں کہانی پڑھتے ہوئے دیکھ کر لگا تھا ایک پہلوان (ظاہر ہے ادبی پہلوان) اکھاڑے میں اتر آیا ہے اور اپنے حریفوں کو للکار رہا ہے۔ یہ اس صدی کے پانچویں دہے کی بات ہے۔ ریذیڈنسی روڑ پر اس زمانے میں سٹیٹ کلچرل کانفرنس کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ کلچرل کانفرنس، کلچرل فرنٹ اور بعد میں کلچرل

کانگریس کے جھنڈے پر ایک نسبتاً وسیع پیمانے پر منظم ہوئی تھی۔ اس میں شاعر ادیب دانشور شریک ہوتے تھے۔ ہفتے میں ایک روز شعر و ادب کی نشست ہوا کرتی تھی کلچرل کانگریس بنیادی طور پر کُل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ نظریاتی طور پر وابستہ تھی اور ریاست کے ترقی پسند فن کار اس کے پس پشت تھے۔ ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا لیکن اب اس کا آہنگ کچھ مدھم پڑ چکا تھا اور وہ نعرہ بازی اور کھلی جذباتیت، جس نے ہنگامی ادب کی بنیاد ڈالی تھی، کم ہو گئی تھی اور فن کو پروپگنڈا کے حصاروں سے علیحدہ کرنے کی معقول کوشش کی گئی تھی۔ اسی دور میں میں نے پریم ناتھ در کو ایک ایسی ہی نشست میں اپنی کہانی پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ میرے لئے ان کی حیثیت ایک عام افسانہ نگار کی تھی جو اتفاق سے کشمیری بھی تھا اور اردو کے وسیلے سے لکھ رہا تھا۔ میں اردو کے کئی کشمیری افسانہ نگاروں کو سن چکا تھا۔ اختر محی الدین، علی محمد لون، بنسی نردوش، دیپک کول، تیج بہادر بھان اور سب سے بڑھ کر پریم ناتھ پردیسی کو — پردیسی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اختر محی الدین اور ان کے ہم عصر تیج بہادر بھان کے بغیر، سب کشمیری کی طرف آ گئے تھے۔ ایسے میں پریم ناتھ در کی کہانی سن کر مجھے عجیب سا لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ در کشمیری ہیں لیکن ان کا لب و لہجہ، ان کے کہنے پڑھنے کا انداز کچھ مختلف تھا۔ مجھے یاد نہیں کون سی کہانی تھی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ حاضرین ہمہ تن گوش تھے اور مسحور بانہ سن رہے تھے۔ گہری خاموشی کے بیچ میں سے ایک پاٹ دار آواز، ایک بے حد گھمبیر آواز سناٹے کو چیر کر سارے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ پریم ناتھ در کے پڑھنے کا انداز نرالا تھا۔ وہ لفظوں کی ادائیگی کے ساتھ آوازوں کے زیر و بم کا بھی خیال رکھے ہوئے تھے۔ کہانی کشمیری ماحول سے متعلق تھی۔ اس میں کشمیر کے معاشرے کی بسورتی ہوئی تصویر پینٹ کی گئی تھی۔ اس میں سے ابھرنے والے انسان کے بے کل باطن اور اس کے داخلی ردِ عمل کی داستان کھل کر سامنے

آتی تھی۔ درؔ نے مدھم لہجے میں گہرے درد کا احساس دلایا تھا۔ میں اس زمانے میں کرشن چندر کے اسلوب کا رسیا تھا۔ اس لئے میں درؔ کے اسلوب سے بالکل متاثر نہ ہوا۔ مجھے الفاظ کی وہ نفاست، زبان کا وہ لوچ، حسن کا وہ سیلاب نہیں ملا جو کرشن چندر کا امتیاز تھا۔ بہرحال محفل ختم ہونے سے پیشتر درؔ نے چند سوالوں کے جواب اعتماد سے دئے۔ میں، جیسے عرض کر چکا ہوں کہ درؔ کے اسلوب بیان سے متاثر نہیں ہوا البتہ ان کی کہانی میں ایک نئے آہنگ کا احساس ضرور ہوا اور روایتوں اور رسُوم و قیود کی زنجیروں کو توڑنے والے ایک فن کار کی تصویر ذہن پر چسپاں ہو گئی۔

پریم ناتھ درؔ کو قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا!

پھر کئی برس گذر گئے۔ میں نے پریم ناتھ درؔ کی دوسری تصویر دیکھی۔

تولہ مولہ کے متبرک چشمے پر ایک پُجاری کے سامنے آلتی پالتی مارے ہوئے سفید کرتے پاجامے اور سیاہ رنگ کے واسکٹ میں ملبوس، سر کو ایک تولیہ سے ڈھکے ہوئے، ماتھے پر سیندور کا تلک، انتہائی شردھا سے پوجا کے منتر الاپتے ہوئے اور پھر اسی لگن اور شردھا کے ساتھ متبرک چشمے کی پریکرما میں مگن ——— کیا یہی "کاغذ کے واسدیو" کے خالق اور کلچرل کانگریس کی میٹنگ میں کہانی پڑھنے والے پریم ناتھ در رہیں ——؟ مجھے شبہ ہونے لگا۔ وہاں تو وہ ایشور سے مذاق کر رہے تھے۔ مگر یہ میرا واہمہ نہیں تھا، حقیقت میرے سامنے تھی۔ وہی بھرے بھرے گال، وہی گھٹا ہوا جسم، وہی پاٹ دار آواز ——— زندگی بھر رسُوم و قیود سے بغاوت کرنے والا مارکسسٹ ——— شاید اپنی جڑیں تلاش کر رہا تھا۔! خواہش کے باوجود، میں نے ان کے سامنے جاکر ان سے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن ایک دوسری تصویر میرے ذہن کی گیلری میں چسپاں ہو گئی۔

پریم ناتھ درؔ کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک ایسے خانوادے سے رہا ہے جس کا تعلق تاریخ کشمیر کے مختلف موڑوں پر شاہی درباروں سے رہا ہے۔ یہاں جاگیردارانہ

نظام کو استوار کرنے والے بھی پیدا ہوئے اور اس سے بغاوت کرنے والے بھی۔
پریم ناتھ ڈر نے شروع ہی سے جو راستہ اپنایا وہ مشکل راستہ تھا۔ اس راستے میں قدم قدم پر دار و رسن کی آزمائشوں کا خطرہ تھا۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا بغاوت تھی۔ پریم ناتھ ڈر ایسے ہی باغی تھے۔ تخلیق کے شعلے کو ہوا دینے سے کئی برس قبل وہ تحریک حریت میں کود پڑے۔ یہ ہماری تحریک آزادی کا ابتدائی دور تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جب شیخ محمد عبداللہ کی رہنمائی میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی تمام اکائیاں نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہوئیں تو چند کشمیری پنڈت بھی اس میں شامل ہوئے۔ ان میں پریم ناتھ بزاز، جیالال کلم، کشپ بندھو، شیام لال صراف جیسے لوگ تھے۔ ان ہی لوگوں کے ساتھ چند کم عمر اور غیر معروف نوجوان بھی شامل تھے۔ ڈر خانوادے سے تعلق رکھنے والے دو نوجوان خاص طور پر قابل ذکر ہیں — ڈی۔ پی۔ ڈر اور پریم ناتھ ڈر۔ یہ دونوں نوجوان اسی دور میں تحریک میں کود پڑے۔ چاہتے تو اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے سہارے ڈوگرہ شاہی میں اچھے عہدے پاتے لیکن یہ لوگ دوسری مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے سینے میں آگ تھی جس میں خاندانی وجاہت سے زیادہ حدت تھی۔ اس زمانے جب نئی تنظیم کے لئے جھنڈا (FLAG) تجویز کرنے کا سوال آیا تو سب سے پہلے پریم ناتھ ڈر نے ہی لال زمین پر ہل والے جھنڈے کے تصور کو ذہن میں تشکیل (CONCEIVE) کیا جو بعد میں پوری تحریک کا پرچم بنا اور ریاست کے لاکھوں لوگوں کے دلوں پر لہراتا رہا۔ تحریک کے قائد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اس بات کا اعتراف خود اپنی سوانح حیات میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"ہم نے تنظیم کے لئے لال زمین پر سفید ہل والے نشان کا جھنڈا بھی منظور کر لیا۔ اس جھنڈے کا بنیادی ڈیزائن ایک جوشیلے کارکن پنڈت

پریم ناتھ در نے پیش کر لیا جس نے تھوڑی ترمیم کے بعد اسے منظور کر لیا"۔

(آتش چنار۔ ص ۴۴)

یہ پریم ناتھ در کی پہلی تخلیق تھی۔

یہ ۱۹۳۸ء کے آس پاس کا زمانہ ہے۔ اس سے پہلے وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے لاہور جا چکے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی وہ لاہور کے قیام کے دوران بائیں بازو کی سیاسی سرگرمیوں سے متاثر ہو چکے تھے اور مارکسی حلقوں کے قریب تھے۔ تحریک خلافت کے دوران تقریباً اٹھارہ ہزار مسلمان ہندوستان سے بھاگ کر افغانستان، ترکی، تاشقند، سمرقند، بخارا وغیرہ جا پہنچے تھے جہاں وہ اشتراکی نظریئے سے متاثر ہو چکے تھے اور جب ہندوستان لوٹے تو اپنے ساتھ یہ نظریہ بھی لے آئے تھے۔ چنانچہ برسوں تک افغانستان کے راستے روس کا اشتراکی لٹریچر ہندوستان آتا رہا جس کے لئے میدان ہموار ہو چکا تھا۔ کیمپوں اور جیلوں میں دہشت پسند قیدیوں نے مارکسزم کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ ٹریڈ یونین اور محنت کش طبقے کی تنظیمیں بن رہی تھیں۔ اس زمانہ میں پریم ناتھ در اشتراکی حلقوں کے قریب آئے اور پارٹی کی ہدایت کے مطابق اشتراکی لٹریچر کو اردو میں منتقل کرنے کے کام میں مدد کرتے رہے۔ اس دوران وہ ادب کے مسائل سے بھی دلچسپی لینے لگے تھے اور اظہار کے لئے پر تول رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے سینے میں چھپے ہوئے طوفان کو لفظوں میں ڈھالتے کہ عملی سیاست نے انہیں پوری طرح گھیر لیا۔ انہوں نے مارکسی عقائد کو اپنا لائحہ عمل بنایا اور مارکس اور لینن کا مطالعہ درسی کتابوں کی طرح کرتے رہے۔ علم اور فلسفے کا یہ مطالعہ انہیں اپنے تخلیقی سفر میں برابر روشنی دیتا رہا۔

ریاست جموں کشمیر میں یہ زمانہ سیاسی اُبال کا زمانہ تھا۔ کشمیریوں کی حالت پورے ملک میں سب سے زیادہ ابتر تھی۔ ایک سروے کے مطابق اس زمانے میں کشمیریوں کی

اوسط سالانہ آمدنی مشکل سے گیارہ روپے فی کس تھی۔ عالمی تاریخ میں غالباً کوئی دوسری مثال نہیں ملے گی جہاں پورے ملک کو روپے کے عوض فروخت کر دیا گیا ہو۔ غلامی کی تاریخ میں ایسا سستا سودا کہیں اور نظر نہیں آتا جہاں صرف پچاس لاکھ روپے کے عوض پوری ریاست اور اس میں بسنے والے لگ بھگ نصف کروڑ انسان مویشیوں کی طرح بیچے گئے ہوں۔ یہ کشمیریوں کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ صدیوں کی نسل در نسل غلامی نے کشمیریوں کو بے حس اور بے عمل بنا دیا تھا۔ مغلوں، پٹھانوں، سکھوں اور اب ڈوگروں کے جاہ و جلال نے کشمیریوں کو مظلومیت، بے چارگی اور بے بسی کا طوق پہنایا تھا۔ زبانوں پر تالے تھے، ضمیر پر پہرا تھا اور سینوں میں داغ تھے۔ تبھی کشمیر کے سیاسی اُفق پر شیخ محمد عبداللہ طلوع ہوئے۔ چند برسوں میں انہوں نے ساری صورتحال کو سمجھ لیا اور مسلم کانفرنس کے نسبتاً محدود سیاسی پلیٹ فارم کو خیرباد کہا اور ایک وسیع، ترقی پسند اور قومی سیاسی نصب العین کے ساتھ ناطہ جوڑا۔ انہوں نے زبانوں کے تالے کھولے، ضمیروں پر پڑے پردے ہٹا دیئے اور سینوں کے داغ دھو کر آنکھوں کی نمی پونچھی۔ انہوں نے بہت پہلے اعلان کیا تھا:-

"میری جدوجہد اپنے وطن کی ترقی اور بہبود کے لئے ہے۔
آؤ! ہم سب کے سب معمولی فرقہ وارانہ اختلافات سے بالاتر ہو کر عوام کی بہبود کے لئے اشتراک اور تعاون سے کوشش کریں"۔

(تاریخ حریت کشمیر جلد دوم - از رشید تاثیر ص ۲۲۵)

o

"میری صرف یہی تمنّا ہے کہ اس ملک کے ہر ایک باشندے کو خوش و خرم دیکھوں اور انہیں انسانی درجہ دلاؤں۔ اس میں مذہب و ملت کی کوئی تمیز نہیں"۔

(کشمیر کا گاندھی - از پریم ناتھ بزاز - ص ۱۰)

شیخ محمد عبداللہ کی مقناطیسی شخصیت نے بہت سے کشمیری پنڈتوں کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیا اور پہلی بار کشمیریوں نے بلا تخصیص مذہب و ملت اپنے درد کا اظہار کرنا شروع کیا تھا۔ پریم ناتھ ڈر جو لاہور کی سیاسی ہواؤں کا لمس محسوس کر چکے تھے اور ایک ترقی پسند اور غیر مذہبی سیاسی تفکر سے متاثر ہو چکے تھے، فوراً ہی اس نئی آواز سے متاثر ہوئے۔ ذکر ہو چکا ہے کہ ابھی کشمیری پنڈتوں نے ذہنی اور جذباتی طور اس تحریک کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا تھا۔ صرف چند نام تھے۔ پریم شیخ عبداللہ کے پرانے دوست اور رفیق پریم ناتھ بزاز، ان کے دست راست بن کر سامنے آئے اور پھر ان کے ساتھ کچھ منچلے اور نو عمر لوگ شامل ہو گئے۔ ان میں پریم ناتھ ڈر بھی تھے۔

اس زمانے میں ڈوگرہ شاہی کا سفاک جلال برہنہ ہو کر سامنے آیا۔ گولیوں کی باڑھ اور لاٹھی چارجوں کی بیدردی کے ساتھ ساتھ قید و بند کے مصائب کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ تحریک کے قائدین میں سے بعض لوگ مصلحتاً کشمیر سے بھاگ کر لاہور میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور اخبارات اور دوسرے ذرائع سے کشمیر کی صورت حال سے متعلق رائے عامہ منظم کرتے رہے۔ ان میں ڈر بھی تھے۔ اس زمانے میں جاگیردارانہ نظام کے ساتھ وابستہ ایجنٹوں نے کانگریس کی لیڈرشپ اور خاص طور پر مہاتما گاندھی کو باور کرایا تھا کہ دراصل کشمیر کی جنگ آزادی، غلامی، ذلت اور ظلم کے خلاف نہیں تھی بلکہ کشمیر کے مسلمان اکثریتی طبقے کی شرارت ہے جو اس لئے باغی ہو گئی ہے کہ حکمران ایک ہندو راجا ہے۔ حالانکہ راجا جمہور نواز ہے۔ یہ رجعت پسند، عوام دشمن اور مفاد پرست جماعتوں کا ایک شوشہ تھا جو اپنے مفادات کے لئے کشمیر سے ابھرتی ہوئی اس آواز کو حکمران طبقے کی شہ پر دبانا چاہتا تھا۔ پریم ناتھ ڈر بھی ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ان شیطانی اور شر پسند عزائم کو بے نقاب کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

عملی سیاست میں پریم ناتھ ڈر قلیل عرصے تک ہی رہ پائے تھے کہ انہیں اپنی گھریلو

ذمہ داریوں نے آگے بڑھنے سے روک دیا اور وہ تلاشِ معاش میں سرگرداں ہوئے۔
انہوں نے سیاست کے میدان سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور صحافت کو اپنی جولاں گاہ بنایا۔
وہ تقریباً تین سال تک مشہور انگریزی روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" کے ساتھ وابستہ
رہے۔ وہاں سے سبکدوش ہوکر روزنامہ "اسٹیٹسمین" میں آگئے اور آخر آل انڈیا
ریڈیو میں ملازم ہو گئے جہاں لگ بھگ ۲۵ برس تک ملازمت کرتے رہے۔ یہیں سے
آخر میں پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد سال بھر محکمہ فیلڈ
پبلسٹی کے صلاح کار رہے۔ ۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ کے پریس ایڈوائزر رہے۔ ۶ ستمبر
۱۹۷۶ء کو سورگباش ہو گئے۔

پریم ناتھ در ۲۵، جولائی ۱۹۱۴ء کو پنڈت رام چند در کے یہاں بڈی یار بالا (سرینگر)
میں پیدا ہوئے تھے۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اردو ہندی اور انگریزی پر دسترس
رکھتے تھے۔ انگریزی اتنی ہی عمدہ لکھتے تھے جتنی کہ اردو ـــــ یہی ان کی کامیاب
صحافتی زندگی کا راز تھا۔

در صاحب کی سب سے بڑی کمزوری کشمیر اور کشمیر کے لوگ تھے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ
انجام دینا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ یہی تشنہ آرزو زندگی بھر
جوالہ مکھی کی طرح ان کے سینے میں دہکتی رہی اور اظہار کے لئے راہیں تلاش کرتی
رہی۔ شمیم احمد شمیم مرحوم نے پریم ناتھ در کو قریب سے دیکھا تھا اور اس اضطرار کو بھی
محسوس کیا تھا جو ان کے روم روم میں ڈھلا ہوا تھا۔ اپنے مضمون "پریم ناتھ در ـــ میرا یار"
میں لکھتے ہیں:۔

"جب میں در صاحب سے ملا میں نے محسوس کیا کہ اس شخص کے وجود
میں ایک آگ ہے، ایک تڑپ ہے اور ایک عجیب طرح کی بے چینی ـــ
وہ ایک عجیب قسم کے احساسِ گناہ میں مبتلا ہے اور وہ اس گناہ کا

کفارہ ادا کرنے کے لئے مضطرب ہے ۔۔۔۔۔"

(روزنامہ آئینہ سرینگر۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۶ء)

یہ آگ اسی ناآسودہ آرزو کے الاؤ کی آگ تھی اور چونکہ درد ایک حساس فنکار تھے لہٰذا اس آگ کی حدت کا احساس رولانا چاہتے تھے۔ آزادی کی جنگ میں وہ ہراول دستے کی جن صفوں میں وہ کسی زمانے میں شامل ہوئے تھے وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ زمانہ انعامات اور صلے کا زمانہ نہیں تھا۔ وہ دار ورسن کی آزمائش کا زمانہ تھا۔ درد نے اپنے ضمیر کو اپنا رہبر بنایا تھا۔ وہ آگہی کی آواز پر آگ کے صحراؤں میں کود پڑے تھے لیکن انہیں آدھے راستے سے ہی لوٹ جانا پڑا تھا۔ یہی گناہ تھا اور اسی کا احساس انہیں عرصۂ دراز تک تڑپاتا رہا جس کا کفارہ ادا کرنے کے لئے انکی روح بے چین تھی ـــــــ اس بے چینی کا اظہار ان کی کہانیوں کا حُسن ہے۔

پریم ناتھ درد کا اصل میدان افسانہ نگاری تھا۔ اس میدان میں ان کے کارنامے قلیل سہی لیکن اس پایہ کے ضرور ہیں کہ اردو کے افسانوی ادب میں اگر ان کا ذکر نہ کیا جائے تو وہ ادبی بددیانتی ہوگی۔ اردو افسانے کے کسی بھی مورخ یا محقق کے لئے پریم ناتھ درد کے نام اور کام کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کی نسل بہت کم پریم ناتھ درد کے کارناموں سے واقف ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے درد نے اعلیٰ معیار کی کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ کافی تاخیر سے اس میدان میں آئے لیکن ان کی دلچسپیوں کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ آنجہانی پریم ناتھ پردیسی کے مکان میں ہونے والی ادبی نشستوں میں وہ موجود ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں اردو افسانے کی پہچان نمایاں طور پر پریم ناتھ پردیسی سے تھی۔ درد نے ابھی افسانہ نگاری میں اپنا کھاتہ نہیں کھولا تھا۔ یہ کام انھوں نے بقدرِ احسن ۱۹۴۵ء میں کیا۔ جب ان کی پہلی کہانی "غلط فہمی" لاہور کے مشہور ماہنامہ "ادبی دنیا" میں شایع ہوئی۔

اسی کے مدیر ماہنامہ صلاح الدین احمد نے سے افسانہ نگار کو متعارف کراتے ہوئے کہا تھا:

"درہ ہمارے افسانوی اُفق پر طلوع ہوتے ہی چمک اٹھا ہے اور اگر وہ نوجوان ہے تو پھر ہمارے موجودہ استادوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے ـــــ درہ بہت جلد ہماری افسانوی حدود کو آگے بڑھائے گا اور فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑے گا۔"

اس کے بعد ان کے ایک سے ایک افسانے منظر عام پر آنے لگے اور وہ مسلسل کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ مولانا کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ چنانچہ درہ کے افسانے یکے بعد دیگرے شائع ہونے لگے تو مولانا نے ایک بار پھر اپنے پہلے بیان پر تصدیق کی مہر ثبت کرتے ہوئے لکھا:۔

"میں نے درہ کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی ـــ کہاں ہیں وہ افسانہ نگار جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے عظیم افسانے لکھے ہیں۔ وہ آئیں اور دیکھیں افسانے یہ ہوتے ہیں ـــ "چائے کی پیالی"[1] کو داخلیت اور نفسی تجزیہ کا معیار سمجھنے والے یہ جان لیں کہ اس معیار کے حدود اور آگے ہیں"۔

۱۹۴۷ء میں بٹوارے کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں عجیب افراط و تفریط کا عالم تھا۔ آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی کیا نہیں دیکھنا پڑا۔ خون میں ڈوبی ہوئی انسانی لاشوں کا سمندر، آگ اور موت کا برہنہ رقص، تبادلہ آبادی اور نقل مکانی، وطن میں بے وطنی کا احساس ـــ ایسے میں ذہن شل تھے اور دماغ ماؤف ہو چکے تھے۔ اَذ کے روایتی مرکز بکھر چکے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کے تخلیقی سوتے بھی آنسو بہاتے بہاتے

[1] "چائے کی پیالی" اپنے دور کا اہم افسانہ ہے جو محمد حسن عسکری نے لکھا تھا۔

سوکھ گئے تھے۔ اب وہ جینا چاہتے تھے۔ نئی صورت حال کے پیش نظر اب وہ سنبھلنا چاہتے تھے لیکن کوئی مشترکہ پلیٹ فارم نہیں تھا۔ ایسے میں ادیبوں اور فن کاروں کو ایک جگہ اکٹھا کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ یہ صلیب بھی پریم ناتھ در نے ہی اٹھائی۔ یہ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اکھڑے ہوئے قدم ایک جگہ جم گئے۔ حلقۂ ارباب ذوق (دہلی) کے نام سے ایک انجمن آراستہ ہوئی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اکھڑ کے ہندوستان آئے تو دہلی میں سب سے پہلے جو ادبی بزم جمی وہ پریم ناتھ در کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان دنوں دلی کالج میں پڑھاتے تھے۔ پریم ناتھ در کے گہرے دوست تھے۔ پریم ناتھ در نے ان کے ساتھ مل کر "حلقۂ ارباب ذوق" کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک طرح سے لاہور کے حلقۂ ارباب ذوق کا تسلسل تھا۔ ذہنی اور جذباتی طور سے"۔

(آنکھیں ترستیاں ہیں ص ۱۷۷)

آزاد صاحب کے بیان کے مطابق پریم ناتھ در نے اس حلقے کو زندہ رکھنے کے لئے بڑی محنت کی۔ ان محفلوں میں در صاحب اور عبادت بریلوی کے علاوہ ساحر لدھیانوی، پرکاش پنڈت، مہدی عباس حسینی، شمیم کرہانی، غلام احمد فرقت، ریوتی سرن شرما، عرش ملسیانی، بلونت سنگھ جیسے فن کار باقاعدگی سے شریک ہوتے۔ اس پر سوز ماحول میں جب اظہار کیلئے کلیجے پھٹنے کو آئے تھے اتنے سارے لوگوں کو اکٹھا کرنا معمولی کارنامہ نہیں۔ یہاں آزاد صاحب کے اس بیان سے بحث نہیں کہ آیا یہ حلقہ لاہور کے حلقۂ ارباب ذوق کا تسلسل تھا یا نہیں۔ کیوں کہ اس حلقے کے بیشتر قلم کار ترقی پسند

تحریک کے ساتھ راست طور پر وابستہ تھے اور حلقہ ارباب ذوق' لاہور کا معاملہ غالباً مختلف تھا۔ آزاد صاحب نے اس حلقے کے تعلق سے شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی اور کہانی کار اوپیندر ناتھ اشک کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حضرات بھی انجمن کے ساتھ وابستہ تھے۔ چنانچہ حلقے کی طرف سے اچھی اور جاندار کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب ہوا تھا۔ پریم ناتھ در کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "کاغذ کا واسدیو" حلقے کے اشاعتی پروگرام کی پہلی کڑی تھا۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے مرتبین جوش ملیح آبادی' عبادت بریلوی اور اوپیندر ناتھ اشک تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کی سرگرمیوں کے حوالے سے انہوں نے پریم ناتھ در کی فنی صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا:-

"کاغذ کا واسدیو ایک ایسا دریچہ ہے جس میں سے آپ حلقہ کی سرگرمیوں کو جھانک سکتے ہیں۔ ان کی جامعیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ حلقہ اپنی سرگرمیوں' اپنے مقصد اور اپنی تحریک کی ایک ٹھوس تصویر پیش کرنا چاہتا تھا اور اس فیصلے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ پریم ناتھ در کے افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت اس کا اولین اور گراں مایہ رُخ ہوگا۔ ہم نے ہرگز اس مجموعہ کو پیش کرتے ہوئے اس کی گونج کی آڑ نہیں لی جو پیشتر ہی در کے افسانے موجودہ افسانوی خلا میں پیدا کر چکے تھے۔ بلکہ ہم نے اس تعلق کو مدنظر رکھا ہے جو حلقہ کو اس فن کار کے ساتھ ہے۔ اس کے فن کی بلندی حلقہ کا اپنا فخر ہے"۔

(کاغذ کا واسدیو)

اس تعارفی نوٹ میں اگرچہ حلقہ ارباب ذوق' دہلی کی ادبی کارگزاریوں کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن ضمناً پریم ناتھ در کی فنی بلندیوں کا بھی اعتراف ہے اور ساتھ

ہی ساتھ مولانا صلاح الدین احمد کے اس دعوٰی کی تصدیق اور توثیق ہوتی ہے جو چند سال قبل در کو اردو افسانے کی دنیا میں متعارف کرتے ہوئے مولانا موصوف نے کیا تھا۔ اردو افسانے کے قارئین کو یاد ہوگا کہ ایک زمانے میں صلاح الدین احمد مرحوم کو اردو افسانے میں جمود کا احساس ہوا تھا اور انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے رسالے "ادبی دنیا" میں کسی افسانے کو شائع نہیں کریں گے جب تک کہ وہ بلند معیار کا نہ ہو۔ پریم ناتھ در کا افسانہ "غلط فہمی" اس چیلنج کا پہلا جواب تھا۔

حلقہ ارباب ذوق کا ذکر آیا ہے تو اس کے تعلق سے یہ کہنا ضروری ہے کہ اس انجمن کے رُوح رواں پریم ناتھ در ہی تھے اور انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے ادیبوں اور شاعروں کی خاصی جماعت اکٹھا کر لی تھی۔ حلقے کی نشستیں ان کے گھر میں ہوتی تھیں اور جو تخلیقات پڑھی جاتی تھیں ان پر ہر زاویے سے بحث ہوتی تھی۔ میرے دوست اور مشہور کہانی کار مانک ٹالہ ان میٹنگوں میں شامل ہوتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> ہر اتوار کو حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے ہر اتوار وہاں جانا شروع کر دیا ....
>
> پریم ناتھ در مرحوم اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو میں ریڈیو کے ہفتہ وار رسالہ "آواز" کے ایڈیٹر تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاس اُن ہی کے کوارٹر میں ہر اتوار کی شام کو ہوتے تھے ......
>
> پریم ناتھ در بڑی دھانسو قسم کی شخصیت تھے اور ان کے سبھی بڑے بڑے مصنفین سے ذاتی تعلقات تھے۔ چنانچہ باہر کے ادیب بھی جب دلی تشریف لاتے تو نہ صرف حلقہ کے ہفتہ وار جلسوں میں مدعو کرتے بلکہ کچھ کو اپنے گھر ہی ٹھہراتے یا کم سے کم دو تین مرتبہ کھانے پر ضرور مدعو کرتے۔"

("فن اور شخصیت" بمبئی۔ آپ بیتی نمبر۔ ص ۲۳۷)

اس بیان سے صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ پریم ناتھ در شعر و ادب کے چراغ کو جلائے رکھنے کیلئے کیا نہیں کرتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنی مصروف زندگی میں سے حلقے کو مستحکم کرنے کے لئے اپنا بیشتر وقت دیتے تھے بلکہ بڑی فراخدلی سے پیسہ بھی خرچتے تھے یہ ہم میں سے کتنے لوگ کرتے ہیں؟

بات میں سے بات نکل آئی ہے۔ مانک ٹالہ نے در صاحب کو اپنے احباب کی دعوتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دوسرے سیاق میں در صاحب کے دوست شمیم احمد شمیم مرحوم نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"در صاحب کی دو کمزوریاں تھیں۔ ایک کھانا اور دوسرے بچے۔ وہ صرف اچھا کھاتے ہی نہیں اچھا پکاتے بھی تھے اور کھانا پکانے اور کھلانے کا شوق، انہیں جنوں کی حد تک تھا۔ انہیں کھانا پکا کر دوست احباب کو کھلانے کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کی تلاش رہتی تھی۔ اور پھر وہ اس ذوق و شوق سے پکانے اور کھلانے میں محو ہو جاتے کہ جیسے ان کی زندگی کا یہی ایک مقصد ہو"۔

(پریم ناتھ در - میرا یار)

راقم السطور نے اس مضمون کے شروع میں پریم ناتھ در کی شخصیت کے دو پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ پریم ناتھ در جو ترقی پسند تھے، جن کے سینے میں آگ کا ایک سمندر چھپا تھا، جو باغی تھے، رسوم و قیود کی دھجیاں اڑاتے تھے اور اپنے افسانوں میں انسان کے درد کی کہانی رقم کرتے تھے ـــــ اور دوسرے در جو دھرم اور عقائد کو اسی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھے جیسے رسوم و قیود کا پابند ایک عام شخص ہو سکتا ہے۔ شمیم مرحوم لکھتے ہیں:۔

"در صاحب بڑے مذہبی آدمی تھے۔ ان کے دل میں بھگوان کا خوف تھا اور انسان کی محبت ـــ وہ پوجا پاٹھ بھی کرتے تھے اور پیروں فقیروں کو

بھی مانتے تھے ۔ لیکن ان کی ذہنیت میں وہ تنگ نظری اور تعصب نہیں تھا کہ جو عام طور کٹر ہندؤں یا کٹر ملاؤں میں ہوتا ہے ۔ وہ ذہنی طور پر ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی سماجی اعتبار سے رسوم و رواج کے سخت پابند تھے "۔

("پریم ناتھ در ۔ میرا یار" ۔ روزنامہ آئینہ ١١ ستمبر ١٩٧٦ء)

میں در صاحب کی شخصیت کے اس تضاد پر بحث نہیں کروں گا ۔

اس مضمون میں پریم ناتھ در کے فن کا تفصیل سے جائزہ لینے کا محل نہیں ہے ایسا کرنا اس مضمون کے SCOPE (دسترس) سے باہر ہے ۔ چند باتیں اختصار سے عرض کروں گا ۔ پریم ناتھ در اردو میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں ۔ اگرچہ ان کے کارنامے قلیل ہیں لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے تخلیقی جوہر اور جودت ذہن کا لوہا منوایا ۔ ان کے افسانوں کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے ہیں :۔

(١) کاغذ کا واسدیو (١٩٤٩ء)

(٢) نیلی آنکھیں (١٩٦٠ء)

(٣) کشمیری زبان میں ایک ڈراما ۔۔ "ہزے گیٔر" (١٩٦٩ء)

اس کے علاوہ اردو اور ہندی میں ان کی کئی کہانیاں شائع ہوئی ہیں ۔ لیکن ان کی حیات کے دوران اردو میں ان کا کوئی اور افسانوی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ۔

پریم ناتھ در کو افسانے کی تکنیک پر بے پناہ قدرت حاصل تھی ۔ ان کے موضوعات سے قطع نظر ان کا ٹریٹمنٹ خلاقانہ بھی تھا اور ماہرانہ بھی ۔ فنی اعتبار سے وہ بیدی اور منٹو کی قبیل کے افسانہ نگار تھے ۔ زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل تھی ۔ لیکن وہ الفاظ کا خزانہ نہیں لٹاتے بلکہ نہایت احتیاط سے الفاظ کا استعمال کرتے تھے ۔ ان کے یہاں شاعری کا احساس نہیں ہوتا ۔ لفظ ایسے استعمال کرتے ہیں کہ ان میں معنی کی جہتیں لپٹی

ہوئی ملتی ہیں۔ ان کے اسلوب میں بہاؤ کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن پیچیدگی بھی نہیں ملتی۔ ان کا اسلوب ان کا منفرد اسلوب ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بلیغ بھی ہے۔ اور مناسب بھی۔ درکے یہاں پلاٹ سازی، کردار نگاری، کہانی کی بُنت اور ترسیل کی فن کاری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تاثر کی وحدت کا خیال بھی رکھتے ہیں اور افسانے کو آغاز سے لے کر اختتام تک مختلف منزلوں میں سے کامیابی سے گذارنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ اس سے ان کی کہانیوں میں فنی اعتبار سے جھول نہیں رہتی۔

"کاغذ کا واسدیو" کے پیش لفظ میں احتشام حسین نے پریم ناتھ در کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"پریم ناتھ در کی افسانہ نویسی کی عمر ابھی کم ہے لیکن تخلیقی ذہن کی صلاحیتیں ابتدائی کارناموں ہی میں نمایاں ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ در نے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُردو افسانہ نگاری کے اس عظیم الشان دور میں کسی نئے افسانہ نگار کا میدان میں آنا اور اپنی جگہ بنانا خود ایک قابل تحسین اور قابل غور بات ہے اور پریم ناتھ در نہ جگہ حاصل کر رہے ہیں"۔

لیکن اس کے بعد در نے اپنے تخلیقی سفر میں کئی چوٹیاں سر کر لیں اور اُردو کے افسانوی ادب میں ایک مقام پیدا کر لیا۔ "نیلی آنکھیں" میں ان کا فن نئی منزلوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

پریم ناتھ در کے یہاں پریم ناتھ پردیسی کی طرح کشمیر کا ذکر آتا ہے۔ لیکن یہ وہ کشمیر نہیں جس کا ذکر اُردو کے کئی بڑے افسانہ نگاروں نے کیا ہے۔ اور کشمیر کی روح کو مسخ کیا ہے۔ در کے افسانوں میں پردیسی ہی کی طرح کشمیر کے برفیلے پانیوں، سدابہار جنگلوں، گہری گھاٹیوں اور نیلی آنکھوں والی دوشیزاؤں کا ذکر نہیں ملتا جن کے ساتھ خیالی

رومانوں کے طومار باندھ کر یہاں کے حسن کی توصیف کی گئی ہے۔ درؔ کی کہانیوں میں بھی یہاں کے جہنم زاروں کی تصویر ملتی ہے۔ بھوک، لاچاری، افلاس اور بدنصیبی کی کہانیاں ملتی ہیں۔ احتشام حسین نے بالکل بجا لکھا ہے:-

> "کشمیر جو بار بار ان کے افسانوں میں آتا ہے اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لئے ہوئے نہیں آتا جن سے رومانوں کا افسوں جگانے کے لئے فضا تیار ہوتی ہے بلکہ ان میں وہ غم آلود اور نشتر آگین کسک ابھرتا ہے جس سے ہم کشمیر کی حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں"۔

میرے نزدیک درؔ کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کا داخلی انداز ہے۔ آج جب ہم جدید افسانے میں دروں بینی، داخلیت اور انفرادیت کی بات کرتے ہیں تو میرا ذہن پریم ناتھ درؔ کے افسانوں کی ایسی ہی خصوصیات کی طرف چلا جاتا ہے۔ درؔ ایک روایتی افسانہ نگار تھے لیکن اپنے روایتی انداز کے باوجود ان کی کہانیوں میں بار بار ایک عجیب انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ انفرادیت مجھے پریم ناتھ پردیسی کے یہاں بھی نظر نہیں آئی۔ ان کا مشاہدہ اس قدر گہرا ہے کہ وہ خارجی سطح کو کھرچ کھرچ کے اندر ہی اندر اپنے کردار کے باطن کے دریچوں میں جھانک لیتے ہیں اور وہاں اس کے داخلی محسوسات کا اندازہ کرتے ہیں۔ باطن اور داخل کی اس بے چینی اور بے کلی کو درؔ نے اپنی بیشتر کہانیوں کا موضوع بنا لیا ہے۔ اس لئے بعض اوقات ان کا اظہار رمزیہ اور مبہم بن جاتا ہے اور بعض اوقات طنز کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن اس ابہام سے ان کے ابلاغ اور ترسیل کے عمل میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے باوصف جیسا کہ ذکر ہو چکا درؔ افسانہ نگاری کے بنیادی فن سے واقف تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ انہوں نے کہانی کے عالمی معیار کو سامنے رکھا تھا۔ اس کی اندھا دھند تقلید نہیں کی تھی بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق اس سے روشنی حاصل کی تھی۔ ایک جگہ فنِ افسانہ

نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ارونگ جیسے استاد نے بھی افسانے کے حدود میں ڈرامائی عمل کی کوشش نہیں کی۔ نہ یہ چاہا کہ افسانے کے حدود میں ڈرامائی عمل آجائے اگر اس نے ذہنی طور پر کوشش کی تو اس بات کی کہ قاری کے دل میں ایک موڈ، ایک جذبہ پیدا کردے۔ اس وقت بھی جبکہ افسانے کا جنم ہوا تب بھی افسانے کے مرکز میں ایک ہی فرد ہوا کرتا تھا۔ اس وقت بھی چاہے وہ ارونگ تھا، پو تھا، اور بعد میں چاہے موپساں یا او ہنری ...... وہاں بھی انہوں نے پلاٹ کا سہارا اس لئے لیا کہ انہیں زندگی کے ہر پہلو کو آشکار کرنا تھا۔ نفس کی بے پایاں گہرائیاں اور اُلجھے ہوئے اُن گنت دھاگوں کی کھوج لگانی تھی، ماحول کی جیتی جاگتی تصویر الفاظ میں کھینچ کر رکھنی تھی، اہم کرداروں کو جنم دینا تھا اور ایک تحیر کو پیدا کرنا تھا......"

(بحوالہ کشمیر میں اُردو۔ حصہ سوم

از عبدالقادر سروری۔ ص ۱۷۰)

نفس کی بے پایاں گہرائیاں پاٹنا اور الجھے ہوئے ان گنت دھاگوں کو کھوجنا پریم ناتھ درؔ کا ایک اہم فنی مقصد تھا۔ انہوں نے نسبتاً بہت کم لکھا ہے لیکن جو لکھا ہے اس میں ان کے گہرے شعور اور فنی عرفان کا احساس ہوتا ہے۔

"ہُرسے گبر"۔ درؔ صاحب کا تین ایکٹوں پر مشتمل ایک ڈراما ہے جو کشمیری میں لکھا گیا ہے۔ یہ ڈراما اسٹیج کے لئے لکھا گیا تھا اور اس کا بنیادی موضوع کشمیری ہندوؤں اور مسلمانوں کا روایتی بھائی چارہ ہے۔ اس ڈرامے کے پیش لفظ میں مصنف نے اپنی آرزو کا اظہار کیا ہے کہ وہ بھی کشمیری زبان میں لکھنا چاہتے تھے

لیکن انہیں ماحول ایسا ملا کہ جس کے باعث انہیں اپنے اظہار کیلئے دوسری زبانوں کا سہارا لینا پڑا۔ اپنی اردو اور ہندی کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس چھوٹے سے ڈرامے کی پہلی بات میں رقمطراز ہیں :-

"یہ حقیقت ہے کہ میری کہانیوں کی بڑی تحسین ہوئی، اردو میں بھی اور ہندی میں بھی۔ مگر سچ بات تو یہ ہے کہ جو کچھ میں لکھتا تھا اس میں کشمیر کی مٹھاس تھی۔ دوسری زبان کے الفاظ میں غیر شعوری طور پر آبشاروں کی چھینٹیں اڑتی تھیں، پہاڑیوں کی گودیوں میں مویشیوں کے ریوڑ اچھلتے کودتے، دیواروں کے بیچ میں برف کے گالے مچلتے ہوئے آگرتے، ڈل کی سطح آب پر تیرتے ہوئے گیت رقص کرتے اور اسی عمل میں میری تحریر از خود شیرینی جذب کرتی"۔

(کشمیری سے ترجمہ۔ "ہ سے گر" ص ۲)

اس بیان سے پریم ناتھ در کے لاشعور میں چھپے فن کار کی اصل معلوم ہوتی ہے۔ ڈرامے میں ان کے اس اعتراف کے باوصف کہ وہ غیر شاعر ہیں شعر ملتے ہیں جو ان کے بقول تک بندی ہی سہی لیکن اس حقیقت پر دال ہے کہ یہ ڈراما جیسا بھی ہے، انہوں نے اپنی مادری زبان میں سوچا تھا اور اس کی تشکیل اسی طرح ذہن میں کی تھی۔

پریم ناتھ در سرزمین کشمیر کے ایک بڑے فن کار تھے۔ اس میں کوئی دو رائیں نہیں۔ پریم ناتھ پردیسی کے بعد وہ ہمارے سب سے بڑے کہانی کار ہیں۔ انہوں نے نہ صرف وقت کی آہٹ سُن لی تھی بلکہ انسان کی بے کلی کو بھی پہچان لیا تھا۔ پردیسی ہی کی طرح لیکن ان سے مختلف انداز میں، انہوں نے اپنے معاشرے کو بڑے خلوص کے ساتھ اپنی کہانیوں میں پیش کیا اور اس بے بسی اور لاچاری کو زبان دی جو ہمارے ماتھے کی لکیروں پر رقم تھی ـــــ ٥
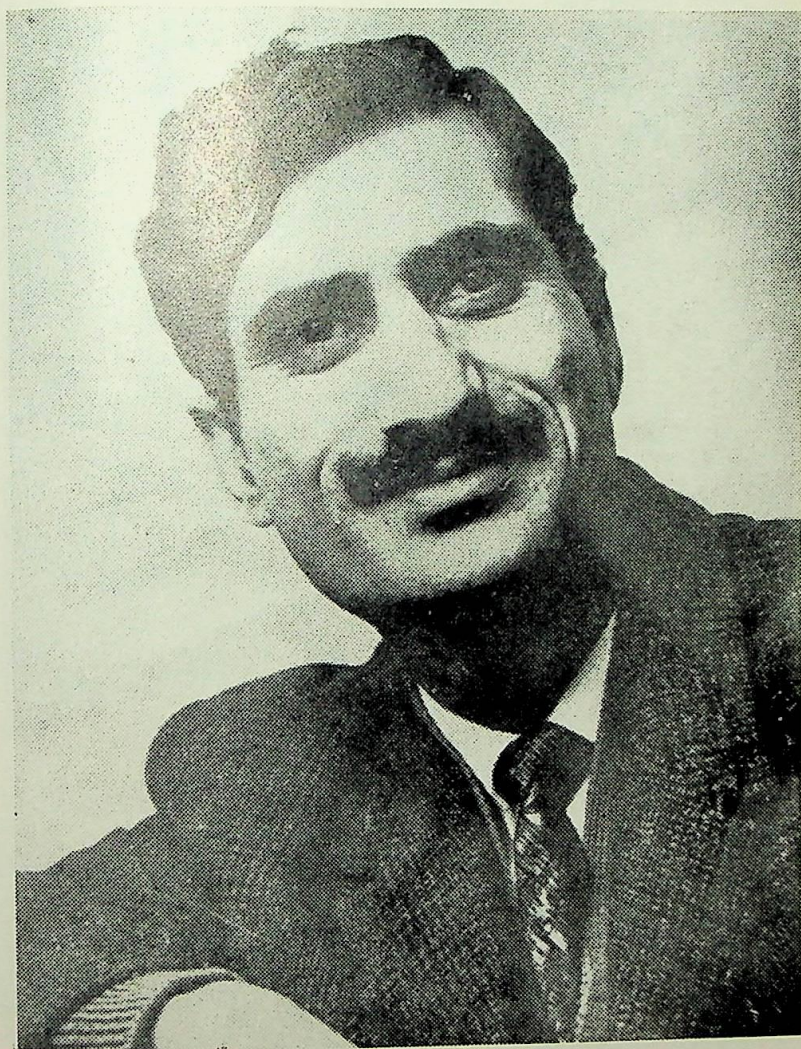
نور محمدؐ

سوم ناتھ سادھُو

رحمٰن راہی

نور محمّد

زندگی میں کوئی غیر معمولی امتیاز حاصل کرنا اگر بڑا پا ہوسکتا ہے تو یہ کہنے
میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مرحوم نور محمد ایک عظیم انسان تھے۔ نور محمد کی عظمت کی
روشنی میں کئی ایک قوس قزح لہرا رہے ہیں۔ لوگ عام طور پر مرحوم کی شخصیت
کے صرف ایک پہلو کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ یعنی کشمیر میں کتابوں کی تجارت
کے حوالے سے اور خاص طور پر کشمیری کتابوں کے فروغ اور پیش رفت میں اُنکی
بے پناہ تڑپ، جرأت اور صبر آزما دل کو سراہنے پر ہی بس کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہر
کشمیری پر واضح ہے کہ کشمیری زبان کو پروان چڑھانے اور کشمیری ادب کی تشہیر
میں نور محمد نے جو شاندار کارنامہ انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن کتب فروشی
کی اس پُر جہاد حسین تصویر نے اُن کے احباب کو اتنا موہ لیا کہ مرحوم کے مجموعی

کلامناموں کے انتہائی اہم زاویوں کے نقوش دھندلا گئے اور انجام کار اُن کے Essential Being کا سب سے بُنیادی اور محوری عنصر ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر طاقِ نسیاں ہو گیا۔ کتب فروش تو نور محمد سے پہلے بھی رہے تھے اور اُن کے بعد بھی متعدد لوگوں نے یہ پیشہ اپنایا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کشمیری کتابیں شایع کرانے کی شروعات بھی نور محمد سے پہلے ہو گئیں تھیں اور ان کے بعد بھی یہ کام کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ نور محمد نے کتابوں کی اس اپنی تجارت میں خوب روپیہ کمائے۔ انہوں نے اتنی دولت کمائی کہ بعض لوگ آج بھی اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ کتب فروشی سے نور محمد کا مطمحِ نظر صرف حصولِ دولت تھا۔ مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب نور محمد نے کشمیری مطبوعات کے بیشمار سستے ایڈیشن شایع کرائے۔ غالباً یہ سوچکر کہ جہاں ایک طرف سستے مال سے گاہک کو ترغیب ملے گی وہاں کتاب کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنے کے بعد منہ سے لگی ہوئی یہ کافر چھُٹ نہیں پائے گی اور بے چارے قاری کے پاس دوسری جلد خریدنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ اس طرح قاری کی تشنہ لبی بھی برقرار رہیگی اور بیوپار کی ندیا بھی ہولے ہولے بہتی رہے گی۔

میں ان لوگوں کو بھی خطاوار قرار نہیں دے سکتا جنہیں اس بات پر پورا یقین تھا کہ نور محمد روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں کنجوس تھے کیونکہ مجھے خود بھی اس بات کا علم ہے کہ باثروت ہونے کے باوجود بھی مرحوم انتہائی سادہ زندگی گذارتے تھے۔ دھان پان سے بدن پر ایک خاص قسم کے بٹن والا کُرتہ

زیبِ تن کئے رہتے تھے۔ ایک عام روایتی کپڑے کا کالر والا یا پھر بند گلا کوٹ پہنے رہتے تھے سفید لٹھے یا پھر "کشمیرے" کی تنگ پائینچے والا پاجامہ جو ٹخنوں سے اوپر رہتا تھا۔ عام معیاری قراقلی ٹوپی پہنے اور پاؤں میں چھوٹا سا بغیر پالش کے چمڑے یا ربڑ یا پھر "ڈُگر گابی" جوتا اُن کی نمایاں شناخت تھی۔ تانگہ ملا تو ٹھیک ریزگاری سے کھنکتی ہوئی جیب میں سے اُسے بھی دو ایک سکے تھما دئے۔ نہ ملا تو پیدل ہی منزل کی جانب لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چل دئے۔ بڑے بڑے بازاروں کے بجائے ویران گلیوں سے چلنا پسند کرتے تھے۔ سفر سے زیادہ قرار کرنے ہی میں قرار آتا تھا۔ شور شرابے سے زیادہ سرگوشیوں کے متمنی تھے۔ گھر سے زیادہ دُکان پر ہی آرام و تسکین محسوس کرتے۔

خواتین سے زیادہ مرد ہی موضوعِ سخن بنتے۔ مرغن غذاؤں سے زیادہ مقامی سادہ روٹی اور قہوے (جس میں سونٹھ اور زیادہ چینی ہوتی) کے شوقین۔ یوں دیکھیں تو ظاہری طور پر اُن کے خدوخال میں بھی کوئی غیر معمولی تیکھا پن نہیں تھا بجز اس کے کہ اُن کا رنگ گورا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اُن کے گورے پن سے میں کبھی مرعوب یا مغلوب نہیں ہو سکا۔ ہاں اُن کی آنکھوں میں مجھے ذہن و ادراک کی ہزاروں چنگاریاں لہراتی نظر آتی تھیں۔ تب تو نورمحمد بقید حیات تھے جب میں اپنی جگہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ان کی غیر معمولی طور چمکتی ہوئی نیلی آنکھوں سے پھوٹتی ان چنگاریوں کی بہار کا نام ہی نور محمد ہے۔ یہ چنگاریاں ہی در اصل اُن کی بے قرار روح اور بے پناہ فہم و فراست کی ترجمان تھیں۔

میں نے پہلی بار نور محمد کو اُس زمانے میں دیکھا تھا جب میں نویں جماعت میں زیر تعلیم تھا یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ جاڑے کے ایام تھے۔ نور محمد کی نیلی آنکھوں میں لہراتی ہوئی چنگاریوں کی بہار نے پہلی ہی ملاقات میں میرے ناآشنا ڈھانچے پہ سحر کر دیا' اس میں آگ لگا دی۔ اور میرے دل کے آئینہ خانے کو جیسے جگمگا دیا۔ نور محمد کی کتابوں کی دکان بڈشاہ ڈُمٹ (گنبد) کے اُس پار آج بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ غالباً دکان پہ بورڈ بھی وہی ہے جس پر جلی حروف میں خوش خط لکھا ہوا ہے۔ "غلام محمد نور محمد تاجران کتب سری رنبیر گنج بازار سری نگر"۔ جن ایام کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں اس دکان سے کتابیں کرایہ پر بھی ملا کرتی تھیں۔ ایک دن کے لئے کرایہ دو پیسے لیا جاتا تھا۔ میں نے پہلی کتاب اس دکان سے کرایہ پہ لی تھی وہ تیرتھ رام فیروز پوری کا کوئی جاسوسی ناول تھا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد جب میں اسے واپس دینے آیا تو دکان پہ خود نور محمد بیٹھے تھے۔ انہوں نے کتاب لیتے ہوئے میرے سراپا پہ ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پوچھا "کیوں میاں! پڑھ لی کتاب؟" میں نے کہا "جی ہاں پڑھ لی"۔ اس پر پوچھا "کیا پایا اس میں؟" میں نے اپنی دانست میں داستان کا خلاصہ پیش کرنا شروع کیا تو انہوں نے ٹوکتے ہوئے پوچھا "نہیں صاحبزادے تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ اس کتاب کے مصنف کا مطمح نظر کیا ہے؟" میں لاجواب ہو کے رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے پہلی بار کسی کتاب میں ڈوب کر مطالعہ کرنے کا احساس دلایا گیا ہو۔ جیسے درسی کتابوں کے بغیر بھی کچھ ایسی کتابیں ہوں جن کی انسان کی زندگی سے نہایت سنجیدہ وابستگی ممکن ہو۔ یہ لمحہ بڑا قیمتی تھا۔

بڑا جادوانی تھا۔ کیونکہ اسی لمحے میرے وجود کی کایا پلٹ ہوگئی۔ یہ ایک "ٹرننگ
پوائنٹ" تھا اور ٹھیک اسی لمحے میں نے مرحوم نور محمد کو من ہی من میں اپنا 'اُستاد'
اپنا رہبر تسلیم کرلیا۔ میں نئی نئی کتابیں کرایہ پہ لیتا رہا اور وہ مجھ سے نت نئے سوالات
پوچھتے رہے اور اس طرح انہوں نے مجھے غیر شعوری طور کتابوں کا ایک زبردست
عاشق بنا دیا۔ اب کتابیں ہی میری ہمکلام اور واحد دوست تھیں۔ اُن کے ساتھ
مختلف موضوعات پر لذّتِ کلام کا سلسلہ چلتا رہا اور مجھ پر متعدد اسرار و
رموز کی گرہیں کھُلنے لگیں۔

نور محمد کے ساتھ ان ہی محفلوں میں مجھے ان کی بے پناہ فہم و فراست
کا احساس ہونے لگا اور آج — جب میں اپنے ماضی میں جھانک کر گذرے
ہوئے ایام کا جائزہ لیتا ہوں تو میرا یہ یقین اور پختہ ہونے لگتا ہے کہ نور محمد کی
شخصیت کا سب سے انمول اور دلآویز پہلو تھا اُن کی یہی عقل و دانش اور
میری دانست میں اُن کے وجود اور اُن کی کارکردگی کے دیگر سارے نمایاں خدوخال
کا سرچشمہ بھی ان کا یہی ذہن و ادراک تھا۔

نور محمد جدید کشمیر میں ریناسانس کے ایک اہم ترجمان تھے۔ جس طرح یورپ
میں اس تحریک کے تحت ہر چیز پہ ایک نئے انداز سے نگاہ ڈالی جاتی تھی، ہر شئے
کو شک و شبہات سے گھورا جاتا تھا ٹھیک اسی طرح مرحوم نور محمد کا مزاج بھی
فطری طور ہر چیز کی حقیقت جاننے پرکھنے کا مشتاق تھا اور اپنے مزاج کی اسی افتاد
کی وجہ سے انہیں کسی جگہ بھی قرار نہیں آتا تھا۔ ذہنی طور ان کی حالت کم و بیش
ایسی ہی تھی جیسی کہ مرزا غالب نے اس شعر میں بات کی ہے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر ایک راہ رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں!

نور محمد سے شرفِ تلمذ سے پہلے میں ایک عام معمولی کشمیری مسلمان لڑکا تھا جس کے ذہن کی دنیا موج بلا کے تھپیڑوں سے قطعی نا آشنا تھی مگر اُن سے ملنے کے بعد میرے ہوش و خرد جس زبردست طغیانی میں مستغرق ہو گئے ان کی گرہیں کھولنے اور ان میں ڈوبنے اُبھرنے کا عمل آج تک جاری ہے۔

مجھے مرحوم نور محمد کے ساتھ کم از کم پندرہ برس کی رفاقت کی سعادت نصیب رہی۔ قربتیں اتنی بڑھیں کہ کبھی کبھار ہی ایسا کوئی دن آتا تھا جب مجھے لطفِ صحبت حاصل نہ ہوتا۔ پہلے پہل تو میں ہی ان سے ملنے کے لئے بے قرار رہتا تھا لیکن بعد میں یہ آگ دونوں طرف لگ گئی اور پھر انہیں بھی میرے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے دو ایک دن تک نہیں مل پاتے تو وہ دُکان کو چھوڑ چھاڑ کر میرے گھر تک آجاتے اور مجھے ڈھونڈنے کے بعد خود اپنے ہمراہ لے جاتے۔ مہاراجگنج کی دکان کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ کھلا رہتا جس کے کاونٹر کے ایک گوشے میں معمولی سے گدیلے پر خود مرحوم نور محمد کتابیں کاغذ قلم وغیرہ بیچتے اور اُن کی غیر حاضری میں مرحوم کے برادر اصغر حُسّہ لالہ* کاروبار سنبھالتے۔ جوں ہی میں پہنچ جاتا تھا تو نور محمد کا کاروباری ہمزاد عنقا ہو جاتا اور اُن کے اندرون سے دانش ور نور محمد نکل کر بے ساختہ طور بڑے لطف، بڑی محبت اور بڑے پتے کی باتیں کرنے لگتا۔ بات کہیں سے شروع ہو جاتی۔ اظہار خیال کا سلسلہ چل نکلتا اور مختلف قسم کی آراء میں ٹکراؤ کی نوبت آجاتی تو نور محمد اپنی مخصوص جگہ حُسّہ لالہ کے لئے خالی چھوڑ کر دوکان کے

---

* ان کا نام محمد حسین ہے لیکن وہ انہیں پیار سے حُسّہ لالہ کہتے تھے

اُس حلقے میں چلے آتے جو باہر سے بند رہتا تھا۔ اور پھر میرے ساتھ سیاسی، ادبی، سماجی
شتی کہ گھریلو اور نہایت نجی معاملات پر بھی اظہارِ خیال کرتے، اگر کبھی بات تلخ محسوس
نہ ہو تو مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ نور محمد کا اس طرح دکان چھوڑ کر بحث و
مباحثوں میں اُلجھنا خسہ لالہ کو پسند نہیں تھا اور میں کبھی کبھی اُن کے ماتھے پر
شکن دیکھ کر شرمسار ہو جاتا تھا۔ ایسی ہی مختلف محفلوں میں اُن کے ساتھ بات چیت
کے دوران مجھے اس بات کی آگہی ہوئی کہ نور محمد کشمیر کی تحریک آزادی کے ابتدائی
دور میں خود بھی عملی طور شریک رہے ہیں اور انہیں اس تحریک کے کاروان کے
سالاروں کے ساتھ قریبی تعلق کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ لیکن بعد میں وہ قدرے
دل برداشتہ سے ہو گئے اور اپنے دانش ورانہ ذہن نے انہیں سحر شکستہ کر دیا۔
دراصل سحر شکنی کا شکار ہونا دانشوری کی تقدیر ہے اور اس تقدیر کی وہ اُلجھنیں
نور محمد کو بھی سہن کرنی پڑی تھیں، جن لوگوں کو اُن سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا تھا
مگر اُن کے اندرون میں جھانکنے کا موقعہ نہیں ملا تھا یا پھر انہوں نے زحمت نہیں
اُٹھائی تھی، وہ اُن کے متعلق طرح طرح کے شکوک میں مبتلا تھے۔ بعض لوگوں کی
دانست میں نور محمد ایک زبردست آستان پرست تھے جو متعدد اولیائے کرام
کے آستانوں پر اپنے دل کی مرادیں پوری کرنے کے لئے دھاگے باندھ کر منتیں مانگا
کرتے تھے، جنہوں نے محبوب العالم حضرت شیخ مخدومؒ کے تئیں اپنی بے پناہ عقیدت
کے طور پر اپنے بیٹے کا نام حمزہ رکھا تھا۔ مگر بعض لوگوں کی نظر میں وہ ایک مرزائی
تھے۔ اور کچھ اور لوگوں نے انہیں بہائی فرقے کا معتقد تسلیم کر لیا تھا۔ ایسے بھی لوگ
تھے جو انہیں قطعی ملحد اور بے دین قرار دیتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حقیقت سے

بہت کم لوگ آگاہ تھے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں یہی کہوں گا کہ نور محمد ساتوں اقلیم کو اپنی پرواز کے دائرے میں لانے کے متمنّی ایک شاہین تھے۔ تمام شیتل ندیوں اور شفاف چشموں کا پانی اپنی گاگر میں بھرنے والا ساگر "لا" اور انکار سے شروعات کرنے والا ایک لامحدود بے کراں ذہن اور الا اللہ یعنی اقرار کرنے والا ایک دھڑکتا ہوا دل۔!

ایک روز میں بلیڈیم سینما آخری شو دیکھنے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر ٹانگہ نہ ملنے کی وجہ سے میں زینہ کدل بہت دیر سے پہنچا۔ اکثر دُکاندار اپنی دُکانیں بند کر چکے تھے رات کے سنّاٹے میں جب میں نور محمد کی دُکان کے سامنے پہنچا تو میرے دل میں نامعلوم وسوسے سر اُبھارنے لگے۔ غالباً کوئی چور اُچکا نور محمد کی دُکان لوٹنے کی ٹوہ میں ہے۔ مگر جب میں دُکان کے نزدیک گیا تب جاکر مجھے معلوم ہوا کہ یہ خود نور محمد ہیں جو دکان کا آخری تختہ بند کرنے سے پہلے کچھ آیات پڑھ رہے ہیں اور ہر آیت کے بعد دُکان کے اندر اور باہر کسی رشی ایسے مُلّا کی طرح دم کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ششدر رہ گیا۔ دن کے اُجالے میں جو نور محمد مذہبی اعتقادات اور مختلف توہمات فلسفیانہ نکتوں اور باریکیوں اور سیاسی نظریات کو تشکیک اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے نہیں تھکتا تھا وہی رات کے وقت اپنے جسم اور اپنی دُکان کو وظائف اور اوراد پڑھ پڑھ کر دم کیا کرتا تھا۔ آخر ایک دن میں اُن سے پوچھ ہی بیٹھا کہ حضرت یہ دوہرے معیار کیا مطلب رکھتے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو مجھے ٹالا پھر توقف کے بعد کہنے لگے کہ حضرت موہانی اشتراکی فلسفہ کے قائل تھے مگر نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے جب ان سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ نماز پڑھنے

ہیں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد اگر پھر سے زندہ نہ ہونا ہو تو کوئی حساب نہیں لیا جائے گا اور نہ اس بات پر افسوس ہوگا کہ خواہ مخواہ نماز کیوں پڑھی تھی۔ لیکن اس کے برعکس اگر واقعی روزِ حساب دفترِ عمل پیش ہوا تو یہ ایک قابلِ فخر عمل، نجات کا ایک بڑا ذریعہ ہوگی۔ مجھے ان کے اس جواز اور اُن کے رویے میں اُس وقت ایک ناخوشگوار تضاد سا محسوس ہوا۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض لوگوں کو اس دوہرے معیار پر اعتراض ہو لیکن آج تقریباً پینتیس برس گزرنے کے بعد جب میں اس صورت حال پر غور و فکر کرتا ہوں تو میرے دل میں مرحوم کے تئیں احترام بڑھتا ہے کیونکہ آج مجھے جو کچھ جاننا پڑا ہے جس کی بازیافت اُس زمانے میں نہیں ہو سکی تھی۔ یعنی یہ دوہرا پن کسی مکّاری یا کسی نفاق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ اُس ذہنی اور جذباتی ایمان داری کا ترجمان ہے جسے جدید اصطلاح میں Ambivalence کہتے ہیں۔

نور محمد ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔ جو بات ذرا جوش اور اعتقاد سے کہی جاتی اُسے وہ اپنی منطق اور دلائل و براہین سے بکھیر کر بے اثر کر دیتے۔ وقت گذرنے کے ساتھ میں ان کی اس عادت سے آشنا ہو گیا۔ چنانچہ جب کبھی میرا دل کسی موضوع کے حق میں اُن کی زور دار بحث سُننے کو کرتا تو میں اُس موضوع کے خلاف زوردار الفاظ میں گرجنے لگتا اور اس طرح اُن کی گرم گفتاری سے محظوظ ہوتا اور اُن کی دانش وری سے فیض اُٹھاتا۔

نور محمد سارے شہر میں بیدار مغز اور باخبر تسلیم کئے جاتے تھے اور اُن کی دُکان ایک اہم تجارتی مرکز کے علاوہ فیض اور عرفان کا ایک سرچشمہ بھی تھی

جہاں تشنہ لب اور ساقی اطراف و اکناف سے آ کر جمع ہو جایا کرتے تھے۔ جہاں رند اور زاہد کی ایک دوسرے سے مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی، جہاں سیاست دان، ادیب، شاعر اور سازندے تک ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے۔ جہاں طالب علم اور عالم کو یک جا ہونے کا موقعہ ملتا۔

غلام احمد مہجور، عبدالاحد آزاد، صمد میر، عبداللہ وزیر، حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، مولوی عبداللہ شوپیانی، پریم ناتھ بزاز، فیض پراچا، چودھری غلام عباس، اللہ رکھا ساغر، عبدالسلام دلال، محمد یوسف قریشی، غلام احمد کشفی، غلام رسول نازکی، اور تنہا انصاری جیسے بزرگوں اور حقیقت کا عرفان رکھنے والی شخصیات سے متعارف ہونے کا شرف مجھے اسی دکان سے حاصل ہوا ہے۔

نور محمد نے طرح طرح کے شوق پال رکھے تھے اور جیسے میں پہلے تحریر کر چکا ہوں ان سب کا سرچشمہ اُن کی پیاسی بے قرار روح تھی۔ وہ ادب کے بھی پرستار تھے اور سیاسیات کے مطالعہ کے بھی۔ جنگ چھڑ جاتی تو وہ تمام اٹلس انہماک سے دیکھتے اور کوئی بھی ریڈیو نیوز بلیٹن سُنے بغیر اُنہیں نیند نہیں آتی تھی جو بھی اخبار اُنہیں معیاری لگتا اُس کا مسلسل مطالعہ کرتے۔ جس کسی کتاب کی تعریف کے چرچے سُنتے اُسے پڑھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ قرآن مجید کا بیشتر حصہ جستہ جستہ اُنہیں یاد تھا۔ کلاسیکل فارسی سے پوری طرح آگہی رکھتے تھے۔ اُردو کے بارے میں یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ شناسی کے فن کے ماہر تھے۔ یہی انگریزی تو اُسے بھی پڑھے بغیر نہیں رہتے۔ دراصل یہ سب کچھ عرفان اور آگہی

کی اُس بے پناہ پیاس کا نتیجہ تھا جس نے نور محمد کو کتابوں کے کاروبار سے وابستہ کر دیا تھا۔ انہیں کشمیر کا نوَل کشور ہی نہیں بلکہ کشمیری زبان کا ایک اہم نگہبان اور کشمیری ادب کا ایک ممتاز ترجمان بنایا تھا۔ اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر نور محمد کشمیری ادب کی طباعت کے ساتھ منسلک نہ ہوئے ہوتے تو اس صورت میں کشمیری زبان کا بیشتر ازلی سرمایہ ضایع ہو گیا ہوتا اور آج جو کچھ بھی ہمارے پاس موجود ہے وہ اس طرح شہروں اور دیہات کے اطراف و اکناف میں پہنچ کر مقبول نہیں ہوا ہوتا۔ اشاعت، تشہیر، ترغیب اور پھیلاؤ کے جو فرائض آج کل ریڈیو اکادمی، یونیورسٹی، اخبار و رسایل وغیرہ مجموعی طور انجام دے رہے ہیں، نور محمد کا ایک اکیلا ادارہ ان دنوں اس سے کہیں زیادہ سرگرم عمل تھا۔

نور محمد نے ضابطوں کے تحت کوئی خاص تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر خداداد صلاحیتوں اور شعور کی بالیدگی کے طفیل وہ عظیم نکتہ داں کا روپ دھارن کر چکے تھے۔ مولانا آزاد کے "الہلال" اور علامہ مشرقی کے تذکروں کا اسلوب اور ان کی تشریح دل آویز انداز میں بیان کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جدید کشمیر کے اُن ابتدائی دانش وروں میں سے ایک ممتاز دانش ور تھے جو ایک طرف نیاز فتح پوری کے نظریہ تشکیک کے رازداں تھے تو دوسری طرف مولانا مودودی کی ایمان پروری کے قائل۔ جو حافظ شیرازی کے معتقد بھی تھے اور علامہ اقبال پر بھی دیوانہ وار فدا ہوئے جا رہے تھے۔ جو عبدالاحد آزاد کی جدت پسندی کے رازداں بھی تھے اور جنہیں مہجور کے اشعار کی نزاکتوں کو سراہنے کا انداز بھی معلوم تھا۔ جو ایک طرف ظفر علی خان اور جوش کے فکر و فن میں فرق کیا کرتے تھے تو دوسری طرف

مجھ جیسے نو آموز کو بھی اشعار کے اسرار و رموز سے مستفیض کیا کرتے تھے جنہیں مختلف مذاہب و عقائد سے کماحقہ واقفیت تھی اور جو اصحاب کہف اور باغ فدا کے فروعی مسائل اور ان کے فروعی مسائل اور ان کے پس منظر سے بہرہ ور تھے جو کشمیر کی جدید اور قدیم تاریخ کے ایک بیش بہا بحر ذخار تھے اور جنہیں ایک ماہر جغرافیات کی طرح متعدد ممالک کے پہاڑوں اور میدانی علاقوں کی پوری علمیت تھی۔

نور محمد کی تیز فہمی اور آگہی کو میرے علاوہ بھی ان گنت لوگوں نے دیکھا اور پرکھا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے گلے میں جو سوز بھر دیا تھا۔ آواز کے اُس لپکتے ہوئے شعلے سے کم ہی لوگ واقف رہے ہوں گے۔

متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ دُکان کو چھوڑ کر نور محمد مجھے اپنے ہمراہ سیر سپاٹے پر لے گئے۔ ہماری کوئی متعین منزل نہیں ہوتی۔ کبھی ڈل کی مخملی لہروں پر شکارے میں سیر ہوتی۔ کبھی ٹانگے پہ سکوت دامن کہسار میں واقع چشمہ شاہی کی تنہائیوں میں۔ کبھی کبھی تو چھنہ پل میں جہلم کے شکستہ سے کنارے پر ہی لاکر بٹھا دیتے اور حافظ شیرازی کے اشعار گنگناتے رہتے۔ کبھی لال منڈی کے دور افتادہ باغ میں خواجہ حبیب اللہ نوشہری کا کلام گاتے۔ لال منڈی کے اسی باغ میں ایک دن نور محمد پر عجیب کیفیت طاری ہوئی اور وہ گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر ایران کی ایک مشہور شاعرہ طاہرہ کی ایک وجد آفرین اور والہانہ غزل نہایت ترنم اور اونچی آواز میں گانے لگے:

بُشریٰ ہلہ بُشریٰ ہلہ بُشریٰ ہلہ بُشریٰ

غالباً باغ میں صرف ہم ہی دو موجود تھے مجھے محسوس ہوا کہ نور محمد جیسے خود ایک

عظیم شاعر تھے جن پر غیب سے اُس وقت یہ اشعار الہام کی صورت میں عطا ہو رہے تھے۔

ہم سب لوگ آج یہاں یوم نور محمد کے انعقاد کے سلسلے میں جمع ہوئے ہیں اور یہ نہایت مسرت اور افتخار کی بات ہے۔ اپنے ماضی کو جاننا اور اپنی عظیم المرتبت شخصیات کی تعظیم کرنا زندہ قوموں کا دستور رہا ہے۔ نور محمد نے اپنی انتھک کاوشوں اور سمجھ بوجھ سے ایک بڑے کاروباری گھرانے کی بنیاد رکھی ہے اور آج ایک ذہین اور شریف خاندان اُن کا وارث ہے۔ اس خاندان کے جو چشم و چراغ آج نور محمد کا نام لیکر فخر محسوس کرتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ خدا سے توفیق کی التجا کریں اور مل جُل کر کوئی ایسی یادگاریں قائم کریں جن سے نور محمد کا نام بھی ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے اور مجموعی طور کشمیری قوم بھی فخر کر سکے۔ چونکہ نور محمد بنیادی طور ایک دانشور تھے اور کشمیری زبان اور ادب کے ایک عالی مرتبت مداح بھی رہے لہذا بہتر رہتا اگر شروعات کے طور کشمیر یونیورسٹی میں "نور محمد گولڈ میڈل" نام کا ایک یادگار میڈل قائم کیا جائے جو ہر سال کشمیری زبان اور کشمیری ادب میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے ایم اے پاس کرنے والے طالب علم کو یونیورسٹی کی طرف سے عطا کیا جائے۔ یہ ریاست کے ایک باوقار ادارے میں مرحوم کی یاد زندہ و تابندہ رکھنے کا ایک باوقار ذریعہ ثابت ہوگی۔ اس نیک کام میں پانچ سات ہزار روپے سے زیادہ صرف نہیں ہونگے۔ یہ رقم کسی بنک میں کھاتہ کھول کر جمع کرائی جا سکتی ہے اور اس کے سالانہ سود سے ہر سال ایک نئے میڈل کا انتظام ہوتا رہے گا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ وما علینا الا البلاغ

(یوم نور محمد کے موقعہ پر ایک سیمنار میں پڑھا گیا۔ کشمیری سے ترجمہ۔

مترجم: غلام محمد آزاد۔

موتی لال ساقی

سوم ناتھ سادھو

سادھو ـــــ

یہ نام سنتے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ اندھیرا چاروں اور گہرا ہو جاتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیا یہ سچ ہے کہ سادھو اب اس دنیا میں نہیں ۔ یقین نہیں آتا کہ وہ شخص مر سکتا ہے جو دوسروں کے لئے جیا ـــ جو دوسروں کو ہنسانے کے لئے ہنستا رہا اپنے اِرد گرد سارے ماحول کو ہنساتا رہا ـــ کبھی مر سکتا ہے ـــ ؟ نہیں ۔ وہ مر نہیں سکتا ۔ وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا ۔ موت تو جسم کی ہوتی ہے ۔ کایا فانی ہے ۔ کایا کا ناش ہوتا ہے مگر آتما سدا زندہ رہتی ہے ۔ آتما کو موت چھو نہیں سکتی ۔ آتما امر ہے ۔ آتما تو پرم آتما کی ایک جھلک ہے اور پرم آتما اکال ہے ۔ اس لئے آتما بھی اکال ہے ۔ شاید اسی وجہ سے یقین نہیں آتا کہ سادھو مر گیا ۔ ہم سے بچھڑ کر دور ہو گیا ۔ مجھے تو وہ اب بھی اپنے سامنے چلتا پھرتا دکھائی پڑتا ہے ۔ وہ تو ابھی ریڈیو کشمیر کے بغل والے کمرے میں چہچہاتا اور مسکراتا تھا ۔ ابھی وہ پُشکر کے ساتھ بیٹھ کر 'زونہ ڈب' کی تازہ قسط کو آخری روپ دے رہا تھا ـــ کہاں گیا وہ ـــــ جو ابھی ہمارے ساتھ ریڈیو کشمیر کے لان میں بیٹھ کر کل نشر ہونے والے ڈرامے کی پروڈکشن کے بارے میں بات کر رہا تھا ۔ "مچامہ" کا "سُلہ گوبہ"

امر رہے گا کیوں کہ وہ ہمیشہ لوگوں کے لئے فرحت کا سامان بہم کرتا رہا ۔ وہ جو "خالق کاک" بن کر جیا ۔۔ کیا کبھی مر سکتا ہے ۔۔ نہیں ۔ وہ نہیں مر سکتا ۔ کیوں کہ فن کی موت نہیں ہوتی ۔ فن کی موت تہذیب اور تمدن کی موت ہوگی ۔ تہذیب کی دھارا تو ہمیشہ بہتی رہے گی ۔ سادھو ہماری فنی وراثت کا درخشاں ستارہ تھا ۔ اس لئے جب تک فن اور کلا زندہ ہے سادھو نہیں مر سکتا ۔ کبھی نہیں مر سکتا ۔ میں تو اس کی بُو باس اب بھی محسوس کرتا ہوں ۔ لگتا ہے کہ وہ ابھی کمرے سے اٹھ کر چلا گیا ہے ۔ وہ بس آتا ہی ہوگا اور آتے ہی ساری محفل کو اپنی رسیلی باتوں سے سرشار کر دے گا ۔ اس کی چھنچھناتی آواز اب بھی میرے کانوں میں شہد گھول دیتی ہے ۔ اس کے شفقت بھرے بول اس وقت بھی میری ڈھارس بندھا رہے ہیں ۔ سادھو زندہ ہے کیوں کہ ابھی بھی اس دنیا میں شرافت، نجابت اور بھائی بندی کی قدریں پنپتی ہیں ۔ اس کا خمیر تو ان ہی چیزوں سے اُٹھا تھا ۔ وہ شرافت اور انکسار کی جیتی جاگتی تصویر تھا ۔ وہ جھاڑنا نہیں بلکہ سرشار کرنا جانتا تھا ۔ دنیا میں جب تک شرافت اور لفاست کے نام لیوا زندہ ہیں سادھو زندہ ہے موت اسے چھو تک نہیں سکتی ۔ وہ شخص جو دوسروں کی خاطر جیتا رہا ہنستا رہا ، ہنساتا رہا ، کیونکر مر سکتا ، میری سمجھ میں نہیں آتا ۔

یہ الگ بات ہے کہ اس کے نام پر کسی رسالے نے کوئی نمبر شائع نہیں کیا ۔ کوئی انعام مقرر نہیں ہوا ۔ کسی یادگاری ٹرافی کا اہتمام نہیں ہوا ۔ وہ جو اس کی دوستی کا دم بھرتے تھے سادھو کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے ایک مضمون لکھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکے وہ لوگ جو پروگرام حاصل کرنے کے لئے کبھی اس کا طواف کرتے تھے آج اس کو بھول گئے ہیں ۔ وہ اداکار جو اس کے ڈراموں کو مفت میں سٹیج کرتے تھے اس کی یاد میں ایک جلسے یا ایک تقریب کا اہتمام نہیں کر سکے ۔ مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود سادھو

---

۵ کمل تھیٹر کی طرف سے ہر سال بہترین اداکار کو سوم ناتھ سادھو ایوارڈ دئے جانے کا اعلان کیا گیا اور ایک سال یہ انعام دیا بھی گیا ۔۔ (ایڈیٹر)

مر نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کی آواز ــــ اس کے فن نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا ہے عوام کے دل میں جگہ بنالی ہے۔ "نذیر" اب جوان ہو گیا ہے مگر سادھو نے جو سبق اسے پڑھایا ہے شاید وہ اسے بھولے گا نہیں۔ "زونہ ڈب" کے اسماعیل کو سادھو کی دین سے انکار نہیں ہوگا، کیوں کہ اس نے بچپن ہی سے فن اور اداکاری کے اسرار و رموز سے اسے آشنا کرا دیا۔ کیا پُشکر اسے بھول سکتا ہے۔ جو اس کا ہم جلیس ہی نہیں ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھا۔ جس کیلئے سادھو نے اس وقت اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا جب وہ دھرتی اور آکاش کے درمیان زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اسے کوئی نہیں بھول سکتا۔ بوڑھے غلام شیخ کو تو اس کی یاد برابر آ رہی ہے۔ ہاں! اگر زمانے کے اُلٹ پھیر میں سب لوگ اسے بھول بھی جائیں میں تو اُسے بھول نہیں سکتا۔ اس کے معصوم چہرے، اس کی فرحت افزا باتوں، اس کی شفقت اور مروت کو کیوں کر بھول سکتا ہوں۔ سادھو میرا دوست بھی تھا اور بھائی بھی ــ اُسے بھول کر یادوں کی کون سی برات لے کر زندگی کی منزلوں کو سر کروں گا۔

سادھو ۴ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو دہلی میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اپنے چاہنے والوں، عزیز و اقارب، دوستوں اور اپنے وطنِ عزیز سے دور ــــ وہاں جہاں جان لیوا بیماریوں میں مبتلا لوگ علاج معالجے کے لئے جاتے رہتے ہیں، وہاں ہی سادھو نے کبھی کو روتا بسورتا چھوڑ کر آن کی آن میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ جب یہ خبر سرینگر میں پھیلی لگتا تھا کہ بجلی گری ہے۔ سب لوگ جیسے سکتے میں آ گئے۔ لوگوں کا ایک گروہ ہوائی اڈے کی اور روانہ ہو گیا۔ منہ لٹکائے ہم سب ہوائی جہاز کا انتظار کر رہے تھے لگتا تھا کہ کشمیر کی ادبی دنیا میں ایک قیامت آ گئی ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی بھیڑ ــ سادھو کا نہیں اس کے شو کا انتظار کر رہی تھی۔ آخری درشنوں کے پیاسے لوگوں پر وقت ایک پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔ کوئی کسی سے بات تک نہیں کرتا تھا۔ لگتا تھا

جیسے سب ایک دوسرے سے نا آشنا ہیں۔ سبھی رشتے ناطے ٹوٹ چکے تھے۔ سادھو کی اچانک موت نے شاید سبھی لوگوں کو یاد دلایا تھا کہ یہ دن اُن کا بھی مقدر ہے۔ اسی لئے بھیڑ کی بھیڑ کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ بالآخر ہوائی جہاز آ گیا۔ شو کو نیچے لایا گیا اور اس کے ساتھ ایک چلتی پھرتی لاش کو بھی نیچے لایا گیا۔ یہ چلتی پھرتی لاش پشکر تھا۔ پشکر بھان سادھو کا لنگوٹیا ——— یقین نہیں آ رہا تھا کہ پشکر اس حادثے سے سنبھل پائے گا مگر وقت کا پھاہا آخر کار دکھ کے گھاؤ بھر دیتا ہے۔ ماتم داروں کا قافلہ سری نگر کی طرف روانہ ہو گیا اور کرن نگر کے شمشان گھاٹ پر سادھو کے شو کو شعلوں کے سپرد کر دیا گیا۔ شام کو ایک مختصر سا ماتمی جلسہ ہوا۔ کچھ دن ذکر یار رہا ——— اور پھر آہستہ آہستہ وقت کا جادو اثر کر گیا۔ اب سادھو کبھی کبھار صرف ان لوگوں کو یاد آتا ہے جو بات بات پر اس کا سہارا تلاش کرتے تھے۔ زمانے کا دستور یہی ہے۔ یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ میری بھی تقدیر ہے اور آپکی بھی۔ اس لئے شکایت کرنا بے معنی ہے۔ وفات کے اگلے دن ڈاکٹر فاروق عبداللہ ماتم پرسی کے لئے سادھو کے گھر گئے۔ جدید کشمیر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب وزیر اعلیٰ ایک فن کار، ایک کلاکار کی ماتم پرسی کے لئے اس کے گھر گیا ہو۔

بھائی کے لئے بھائی کا ماتم کرنا کوئی نئی بات نہیں مگر وہ بھائی جس نے عوام کا بھائی بن کر زندگی کی کٹھنائیوں کو پار کیا تھا۔ جسے اپنے دوستوں کے دُکھ درد کا بوجھ دبائے اور پریشان کئے رکھتا تھا۔ وہ بھائی جب بنا کچھ کہے چلا جائے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ماتم داری کا بوجھ اٹھانا کس قدر مشکل ہے۔ میرے لئے تو یہ بوجھ اٹھانا اور بھی کٹھن ہے کیوں کہ سادھو نے مجھے کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔

میں تین سال تک سادھو کے بالکل قریب رہا۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک۔ دن میں ہم کم و بیش دس گھنٹے ایک ساتھ رہتے تھے۔ ان کا چھوٹا سا کمرہ ہمارا چوپال

تھا۔ اُن دنوں اوتار کرشن رہبر بھی سادھو کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ہم لوگ گھنٹوں باتیں کیا کرتے، گپیں ہانکتے، پروگراموں کی روپ ریکھا پر بات کرتے۔ اس طرح وقت سُرعت کے ساتھ گزر جاتا تھا۔ کبھی کبھی جگن ناتھ ساقی روپیے پیسے کی تلاش میں آدھمکتے۔ میں نے سادھو کو انہیں کبھی بھی خالی ہاتھ لوٹاتے نہیں دیکھا۔ پیسہ ان کے ہاتھ میں آجاتا تو وہ چہک اُٹھتے اور ساری محفل کو اپنی زعفران زار باتوں سے لوٹ پوٹ کر دیتے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی بھی اُس کی صحبت میں اپنے آپ کو غیر محسوس نہیں کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس وقت وہ ریڈیو میں خاندانی بہبود کے ایکسٹینشن آفیسر کے فرائض انجام دے رہا تھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا برتاؤ برادرانہ تھا۔ وہ سبھوں کو اپنے برابر شمار کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سب لوگ اسکی راہ میں جان نچھاور کرتے تھے۔ میں نے اس کے ماتھے پہ کبھی شکن نہیں دیکھی۔ اسے دیکھ کر مجھے لیونارڈو ونچی کا شہرہ آفاق مجسمہ مونا لیزا اکثر یاد آتا تھا جس کے بارے میں ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ مجسمے کے چہرے سے طرب ٹپکتا ہے یا کرب۔ میں نے سادھو کو کبھی کسی کو ڈانٹتے یا کوستے نہیں دیکھا کسی کی چغل خوری کرتے نہیں سنا۔ اُسے تو بس کام سے کام رہتا تھا۔ دراصل وہ سراپا ایک شریف انسان، ایک فن کار تھا۔ اس کی ذات افسانہ نہیں بلکہ ایک بھرپور ناول کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس ناول کا ہیرو خود سادھو تھا، جو آج کل کے دور کا گوتم نیلامبر تھا، جو ایک دنیا کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا، جس کے چہرے پر بودھ بھکشوؤں کا جیسا سکون تھا، جس کا سوبھاؤ شانت تھا اور جس کے مزاج میں بسنت کی خوشبو رسی اور بسی تھی ——!

میں سادھو کو تب بھی جانتا تھا جب وہ سٹاف آرٹسٹ تھا۔ میں نے اسکی دوستی کا شہد تب بھی چکھا جب وہ اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ اس کی چھتر چھایا میں

آرام کرنے کا موقع مجھے تب بھی ملا جب وہ سٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا، جب بھی اس سے ملا، اس کا ایک ہی روپ تھا ـــــ ایک بھائی، دوست اور ہمدرد کا روپ۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور اپنی رسیلی باتوں سے ڈھارس بندھائی۔ کتنی ہی بار مجھے دکھوں کے گرداب سے باہر نکالا۔ ۱۹۷۰ء میں مجھے ریڈیو سے واپس جانا پڑا ـــ میری تنخواہ مہینوں بند رہی۔ سادھو اور لشکر نے مل کر میرے لئے ایک ترکیب نکالی ــ جو تنخواہ مجھے ریڈیو سے ملتی تھی اس کے برابر رقم مجھے مختلف پروگراموں میں حصّہ لینے کے لئے تب تک ملتی رہی جب تک کہ میری تنخواہ واگذار ہو گئی۔ اس کے باوجود جب بھی میں ریڈیو سٹیشن جاتا تو سادھو ضرور سوال کر بیٹھتا ـــ "بھئی ساقی کہیں کوئی مشکل تو نہیں۔ پروگراموں میں تمہیں اپنا حصّہ ملتا ہے کہ نہیں۔ کہیں تمہیں تنگدستی کا سامنا تو نہیں" وغیرہ وغیرہ ـ حالانکہ میری مالی حالت پہلے سے کہیں بہتر تھی۔ کیوں کہ میں ریڈیو سے آزاد ہو گیا تھا اور کام فرصت کے ساتھ کرنے کے مواقع پیدا ہو چلے تھے۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ ریڈیو اچھے بھلے لیکھکوں اور کلاکاروں کو چبا جاتا ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو شل کر کے رکھ دیتا ہے۔ اثر لکھنوی نے ایک جگہ مجازؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک کینسر پیدا ہو گیا تھا جسے ترقی پسند بھیڑیئے اٹھا لے گئے اور ہمارے سادھو کو ریڈیو نے اس طرح چبا کے رکھ دیا کہ دل میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ خیر۔

ریڈیو سے خلاصی کے بعد میں سادھو سے بار بار ملتا رہا۔ مگر میں نے اس کے خلوص میں کسی موڑ یا مرحلے پر تبدیلی محسوس نہیں کی۔ وہی ہنس مکھ سادھو جو قہقہے لگاتا تھا، وہی پُر متانت باتیں، وہی اپنائیت اور وہی پیار ـــ میں نے اسے ہمیشہ اسی روپ میں دیکھا۔ گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ کچھ اپنی کہتا کچھ میری سنتا پر اکثر مجھ سے سوال کرتا۔ وجےؔ کو کئی دن سے دیکھا نہیں، کیا بات ہے ٹھیک تو ہے

؎ وجے کمار۔ میرا بیٹا (م۔ ل۔ س)

نا۔ میں جواب دیتا "بچہ ہے یہاں آنا بھول گیا ہوگا"۔ مگر وہ زور دے کر کہتا "اُسے کہو میرے پاس آئے۔ میں تھوڑا ہی ہمیشہ یہاں رہنے والا ہوں"۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ایک سچائی کے چہرے سے نقاب کشائی کر رہا ہے جو سچائی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ سادھو ریڈیو کشمیر جموں کا سٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ ایک دفعہ مجھے جموں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہنچا تو سادھو سے ملے بغیر کیسے رہا جاتا۔ چنانچہ میں نے ملاقات کے لئے سٹیشن کی راہ لی۔ دروازے پر پہنچا تو اسے سٹیشن سے پیدل باہر آتے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے سوال کیا "بھائی بات کیا ہے کہ اس قدر بے صبری سے گلے مل رہے ہو۔ ہمیں تو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گذرا ہے"۔ میری بات پر سادھو ہنس دیا مگر فوراً سنجیدہ ہو کر بول اٹھا "ساقی کیا بتاؤں۔ یہاں جموں میں بات کرنے کو ترستا ہوں۔ جن دوستوں کے ساتھ زندگی بسر کی، اُن سے کٹ کے رہ گیا ہوں اور جن لوگوں میں آپھنسا ہوں اُن کے وارے ہی نیارے ہیں۔ ادب کی بات کرو تو تلوار کا جواب آتا ہے۔ ڈرامے کی بات کرو تو شراب کے گن گائے جاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں سے کہاں آگیا ہوں"۔ اس کے بعد وہ مجھے ڈیرے لے گیا۔ رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں باقی باتوں کو کل کے لئے اٹھا رکھا اور میں دیر سے ڈیرے سے لوٹا۔

سادھو کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ اس نے اصلی چہرے پر نقلی چہرہ نہیں نہیں چڑھا رکھا تھا۔ وہ ریاکار نہیں تھا۔ اس کا اندرون اور بیرون ایک جیسا تھا۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنہوں نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ سادھو جیسا دوست اور بھائی تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتا۔ اور جب مل جائے تو کیا کہنے۔ ایسا دوست ملنا تو دونوں جہاں پانے کے مصداق ہے۔ کیا کبھی ہماری ملاقات ہوگی ایسے آدمی سے، جو سادھو کا متبادل ہو۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کیوں کہ ایسی آدمی میں نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں

مجھے دوسرا سادھو کہیں نظر نہیں آیا ــــ اتنا سادھو کے ساتھ میری آخری ملاقات کب ہوئی پوری طرح یاد نہیں۔ البتہ ۱۹۸۲ء کے گرما کے دن تھے۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ رخصت ہوتے وقت میں نے اُسے یاد دلایا کہ وہ اپنی کتاب کا دیباچہ لکھ دے جو کتاب کتابت کیلئے اس نے میری وساطت سے محمد یوسف مسکین کو دی ہے اور جس کا مسودہ ابھی تک اسی کے پاس ہے۔ میری یاد دہانی پر وہ ہنس پڑا اور کہا۔ لداخ میں رہ کر تو میں یہ کام نہیں کر سکا مگر اب کے دہلی پہنچتے ہی یہ کام پورا کروں گا۔ کتاب کا دیباچہ دہلی سے تو نہیں آیا۔ البتہ اس کے شو کو لینے کے لئے ہمیں ہوائی اڈے جانا پڑا۔ سادھو کی کتاب میرے اوپر ایک ایسا بوجھ ایک ایسا قرضہ ہے جسے چکائے بغیر میں مرنا نہیں چاہتا۔

کشمیر کا پہلا مستند افسانہ نگار جس نے اردو دنیا سے اپنا لوہا منوایا پریم ناتھ پردیسی ہے۔ اگر کوئی آج مجھ سے سوال کرے کہ پردیسی کا کون سا افسانہ شاہکار ہے تو میرا جواب بلا جھجک ہوگا ــــ "سوم ناتھ سادھو"۔ کیوں کہ سادھو نے ایک لمحے کیلئے ہم سب کو تحیر میں ڈال دیا اور پھر چلا گیا۔ وہاں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ سادھو ایک ایسا افسانہ بن کر جیا جس کے اندر کتنے ہی ضخیم ناول سسکتے سسکتے دم توڑ بیٹھے۔ وہ آج کے زمانے کا منصور علی خان تھا۔ منصور علی خان جو ہندوستانی تمدن کی ایک علامت ہے۔

براڈکاسٹنگ کی تاریخ میں سادھو کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس نے ایک ایسے فیملی فیچر کی ابتدا کی جو گذشتہ ۲۳/۲۲ سال سے کم و بیش روزانہ نشر ہوتا ہے اور جس کی افادیت ابھی تک قائم ہے۔ یہ فیچر جسے سادھو ایک دہائی تک اپنے قلم اور اداکاری سے سینچتا رہا کشمیر کے لوگوں کی زندگی کا ایک حصّہ بن گیا تھا۔ چنانچہ اب زونہ ڈب کشمیری میں کم و بیش ایک تاریخ بن گئی ہے۔ اس فیچر کے اتنے متوالے پشکر ہیں۔ سادھو

تو رہا نہیں اور پشکر اب ریٹائر ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اب زونہ ڈب کے ریٹائر ہونے کے دن بھی آ پہنچے ہیں۔ سادھو کی موت سے براڈکاسٹنگ کے شعبے میں ایک خلا پیدا ہو گیا جو کبھی پورا نہیں ہو گا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ سرکاری کام کبھی رُکتا نہیں۔ اور اسے رکنا بھی نہیں چاہیئے کیوں کہ رکنا موت کی علامت ہے۔ سادھو کتنا اچھا اداکار تھا اس کا تو اب صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی سنگیت کی مدھرتا لئے آواز اور ہنسی ایک سماں باندھ دیتی تھی۔ جب وہ مکالمے ادا کرتا تھا تو اس وقت لگتا تھا کہ گلاب اپنی پنکھڑیوں کو بڑی آہستگی سے کھول رہا ہے۔ اداکار اور منتظم سادھو ادیب بھی تھا۔ ڈرامانگار اور ایسے (ESSAY) لکھنے والا۔ اس کے ڈراموں کا ایک اپنا انداز تھا۔ اس نے نقل کی بجائے اپنا راستہ خود ہی تراش لیا تھا۔ اسکی تحریر میں طنز کے ایسے شعلے لپکتے ہیں جو مجرم کو جھلسائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کی تحریر کا تیکھا پن اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا تھا۔ اس کے ڈراموں کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ وہ کردار کی ذات میں اتر کر اس کے اندرون کو کاغذ پر بکھیرتا تھا۔ وہ کرداروں کے نفسیاتی تجزیئے میں کافی غور و خوض سے کام لیتا تھا۔ جیتی جاگتی زندگی سے لئے گئے اس کے کردار پورے سماج کی قدروں کے عکاس ہیں۔ اس کے دو ڈرامے "خالق کاک" اور "نوز نوش" جدید سماج کے کھوکھلے پن کے چہرے کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے کہ تخلیق کے پردے کے پیچھے فن کار کی شخصیت جھلکتی ہے اور فن کا نقطہ نظر فن کار کے اندر کی آواز ہوتا ہے تو سادھو کے کئی ڈرامے اس کی ذات کا آئینہ ہیں۔ سادھو سے ملاقات کے متمنی اس کے ڈرامے "خالق کاک" کا مطالعہ کر کے اب بھی اس سے مل سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ اب ہمارے درمیان موجود نہیں مگر اس ڈرامے کا مرکزی کردار کوئی اور نہیں خود سادھو ہے۔ خلوص اور انسانیت کا پیکر، جو پھول اگاتا ہے مگر کانٹے اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف نام کا ہے!

؎ حال ہی میں یہ پروگرام بند کر دیا گیا ہے

سادھو نے لشکر کے ساتھ مل کر کشمیری کو بہت ہی خوبصورت کردار دئے ہیں جو اپنے زمانے کی لطافتوں اور کثافتوں کا آئینہ ہیں۔ "بب جی" "آغہ صاب" "آغہ بائے" "چھر کھ چھو" "قبلی عالم" "رمبہ" "مومہ پیچ" ایسے کردار ہیں جو بار بار یاد کئے جائیں گے۔

۱۹۶۵ء کی ہند۔پاک جنگ کے دوران ریڈیو کشمیر سے "زونہ ڈب" نام کا ایک فیچر روزانہ صبح نو بجے نشر ہوتا تھا جو اتنا مقبول ہوا کہ بستر سے اٹھتے ہی عام آدمی کا ہاتھ ریڈیو کی طرف جاتا تھا۔ وہ لوگ بھی اس فیچر کو سُننے بغیر نہیں رہتے جو فیچر کے مقاصد سے متفق نہیں تھے۔ کسی فیچر کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ روایت ہے کہ جنگ بندی کے وقت پاکستان نے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ جنگ بندی کے ساتھ اس فیچر کو بھی بند کیا جانا چاہیئے۔ فیچر کا خالق سادھو تھا جو "قبلی عالم" کا رول ادا کرتا تھا۔ یہی حال "بب جی" کا بھی تھا۔ جس روز یہ فیچر نشر ہوتا تھا گھر کے بڑے بوڑھے بغلیں جھانکنے لگتے کہ کہیں اب کے کچھ ہمارے بارے تو نہیں ہے۔ اس فیچر میں جدید اور قدیم قدروں کے ٹکراؤ کو نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔

اب کون کشمیری ہوگا جو "زونہ ڈب" کے نام سے واقف نہیں۔ یہ روزانہ فیچر کشمیر کی سماجی زندگی کا آئینہ خانہ رہا ہے۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے اس فیچر کے گذشتہ سالوں کے فائل اگر دیکھے جائیں تو اس دور کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی مکمل تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ جن دنوں سادھو اس فیچر کا انچارج تھا روزانہ فیچر ہونے کے باوصف سامعین کو کبھی بھی باسی پن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ فیچر پروگرام کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اداکاروں کے درمیان اس قدر ہم آہنگی اور اپنا پن تھا کہ آغہ صاب، آغہ بائے، مومہ پیچ اور نذیرہ سچ مچ ایک ہی گھرانے کے افراد لگتے تھے۔

سادھو کی شخصیت اندر سے منقسم تھی جس کے کئی رنگ ہیں مگر وجود ایک ہی ہے جو

آنکھ جھپکنے میں اُبھرآتی ہے اور آنکھ جھپکنے کے ساتھ ہی تحلیل ہوجاتی ہے۔ اسی طرح سادھو نے ہمارے درمیان رہ کر رنگ بکھیر کے رکھ دیئے اور تحلیل ہوگیا۔ اُس نے ۵۴ سے زیادہ ڈرامے ریڈیو اور سٹیج کے لئے لکھے۔ اس کی کاوشِ قلم کا نتیجہ کچھ ایسے (ESSAY) بھی ہیں۔ اس کی تحریر کا اکثر و بیشتر حصہ ابھی تک چھپ نہیں سکا ہے۔ اس کے ڈرامے سننے والے کو بہا کے لے جاتے ہیں۔ یہی اس کے فن کا اعجاز ہے۔

سادھو کے کامیاب ڈراموں میں "جانکی" "لوکٹ بعث" "نرنگ" "شمع دان" "باگہ وان" "شرط" "آولُن" اور "ریہرسل" اب بھی سامعین کے ذہنوں پر نقش ہیں۔ "نوُنوش" اور "خالق کاک" سادھو کے ایسے دو ڈرامے ہیں جو کشمیری ادب میں مستقل جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ "ریہرسل" ڈرامے کو اس نے پشکر کی رفاقت میں "گرینڈ ریہرسل" کے نام سے سٹیج کے لئے لکھا۔ اس ڈرامے کے مسودے کو کلچرل اکادمی نے انعام کے لئے منتخب کیا۔ "زونہ ڈب" کی کامیابی پر اس کو ۱۹۷۲ء میں صدرِ جمہوریہ نے "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا۔ سادھو کے ساتھ یہ اعزاز مریم بیگم اور پشکر بھان کو بھی اُسی سال دیا گیا۔ ڈراموں کے علاوہ جو معلوماتی فیچر وغیرہ اس نے لکھے، ان کی گنتی کرنا ممکن نہیں۔ صرف زونہ ڈب کو ہی لیجئے اور کہیئے کہ تعداد کیا ہوگی۔

سادھو کے لکھنے کا طریقہ بھی کچھ انوکھا تھا۔ عام لکھنے والا تنہائی میں سوچ سمجھ کر لکھتا ہے مگر سادھو لوگوں کے بیچ بیٹھ کر لکھتا تھا۔ آپ سے بات بھی ہو رہی تھی اور مکالمہ بھی لکھا جاتا تھا۔ سگریٹ کے کش بھی لئے جاتے تھے، بیچ بیچ میں چائے کی چسکی کا مزا بھی لیا جاتا اور وقفہ کے دوران قلم حرکت میں آکر کاغذ کو سیاہ کرتا جاتا تھا۔

سادھو کا جنم ۵ راگست ۱۹۳۵ء کو ملک آنگن فتحکدل (سرینگر) میں ہوا تھا۔ اس کے والد پنڈت پریم ناتھ پردیسی جو کسی زمانے میں سرکاری عتاب سے بچنے کے لئے بالکم نام بازی

کے نام سے بھی لکھتے تھے' اُردو کے جانے مانے افسانہ نگار تھے۔ پریمی کے کئی افسانوی
مجموعے شائع ہو چکے ہیں مگر اب نایاب ہیں۔ ادب کے رسیا اور ادیب پریم ناتھ
پردیسی نے اپنے بڑے بیٹے سوم ناتھ کو سائینس کی راہ پر لگانے کی سعی کی کیوں کہ
انہوں نے ادب کی دنیا کا مزا چکھا تھا اور بھانپ لیا تھا کہ یہ دنیا گھاٹے کی دنیا ہے
اور اس دنیا میں رہ کر سکھ چین کی تمنا کرنا ناممکن ہے۔ سومناتھ اس راہ پر کچھ دور
تک چلا۔ بی۔ایس۔سی کے بعد اس نے ایم۔ایس۔سی میں داخلہ لیا مگر عین اسی موڑ
پر پردیسی صاحب معدے کے آپریشن کے بعد پرلوک سدھارے اور پڑھائی کو
ادھورا چھوڑ کر سادھو کو گرہستی کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ کیوں کہ اب وہ گھر کا سربراہ تھا
جسے بیک وقت باپ اور بھائی کا رول نبھانے کے ساتھ ساتھ گھر کی گاڑی کو بھی کھینچنا
تھا، ہر ذمہ داری کو کندھا دینا اس کا مقدر بن چکا تھا۔ واپس آیا تو ریڈیو میں
سٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے معمولی تنخواہ پر ملازم ہو گیا۔ کیوں کہ اب صرف یہی ایک
راستہ اس کے سامنے کھلا تھا۔ اس سلسلے میں سادھو نے میرے نام ایک خط میں
لکھا ہے :۔

(خط کشمیری میں ہے مگر میں اس کا اردو ترجمہ درج کر رہا ہوں)

" اپنی زندگی کا حال کیا لکھوں۔ یہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ پتاجی
مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر میں مسخرہ بن کے رہ گیا"۔

سادھو نے ۱۹۵۵ء میں ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں اسے سائنس کے بدلے
زبان کا سہارا لینا پڑا۔ تجربات کی دنیا میں گزر بسر کرنے والے سادھو کو الفاظ کے گلدستے
سجانا پڑے۔ مگر اس نے جلد ہی اپنے آپ کو نئے سفر کے لئے تیار کیا اور اس طرح تیار
کیا کہ کامیابی نے اس کے پیر چوم لئے۔ جس ادبی ماحول میں اس نے تربیت پائی تھی
وہ ادبی ماحول ریڈیو میں ملازم ہونے کے بعد اس کا بیش قیمت اثاثہ بھی بن گیا اور رہبر

بھی ۔ مذکورہ بالا خط میں اس نے مزید لکھا ہے :۔

" مجھے بچپن سے ہی ادب کے ساتھ تھوڑا بہت شغف تھا۔ جب پتاجی زندہ تھے ان دنوں ہمارے گھر ہر اتوار کو ادبی مجلس ہوا کرتی تھی جس میں ریاست اور ریاست سے باہر کے ادبا شریک ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں مجھے مہجور صاحب، عاصی صاحب، رامانند ساگر، بلراج ساہنی، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیارتھی، ڈاکٹر تاثیر، پروفیسر ہاشمی اور سہیل عظیم آبادی جیسے جلیل القدر ادبا کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان محفلوں میں میری ڈیوٹی مہمانوں کو چائے اور سگریٹ پیش کر کے ایک کونے میں بیٹھ کر بحث کا لطف لینا ہوتا تھا۔ اُن دنوں تیرہ اردو رسالے ہمارے گھر آتے تھے۔ میں یہ رسالے باقاعدگی کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ پتاجی نے مجھے رسالے پڑھتے دیکھ کر ایک دو بار کھری کھری سنائی۔ میرا رسالہ پڑھنے کا شوق تو جاتا رہا مگر چنگاری بجھنے نہیں پائی۔ یہی چنگاری بعد میں میرے کام آئی "۔

سادھو نے سٹیج پر بھی کام کیا اور فلم میں بھی۔ مچامہ سیریز کا "سُلہ گوٹہ" تو کشمیری کا یادگار کردار ہے۔

میری نظروں میں سادھو ایک دیوتا تھا جو دیولوک کو چھوڑ کر تھوڑے دنوں کے لئے زمین پر آگیا تھا۔ دیوتاؤں نے اُسے بلایا اور چلا گیا، ہمیں روتا بسورتا چھوڑ کر۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

صوفیانہ کلام کے عظیم اُستاد مرحوم رمضان جو

نور محمد بٹ

استاد رمضان جو

نام رمضان اور "جو"[1] محض عزت و توقیر کے طور پر اس کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ آج سے چار دہائی پہلے کشمیر میں ادھیڑ عمر یا بزرگ مرد کیلئے "جو" کا لفظ عام طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اسی عمر کی عورت کیلئے "دید" مثلاً لل دید، پرژ دید وغیرہ۔ لیکن اب ہمارے ہاں ماحول میں نزاکت آنے سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے رمضان جو نے ۹۰ یا ۹۱ سال کی عمر پائی اور اس صدی کی ۸ ویں دہائی میں انتقال کر گئے۔ زندگی کے آخری ایام تک گانے بجاتے رہے۔ البتہ عمر کے آخری برسوں

---

[1] روس میں بھی اکثر ناموں کا لاحقہ "وو" یا ووف ہوتا ہے۔ مثلاً کردوچوف، مالوٹوف، گوربچوو یا گوربچوف وغیرہ۔ ہمارے ہاں جب کسی کا نام لیکر پکارا جاتا ہے تو اس کے نام کے ساتھ "وو" لگایا جاتا ہے مثلاً غفار کو غفارو۔ ستار کو ستارو۔

میں سنطور کی بجائے زیادہ تر کشمیری ستار بجاتے تھے۔ اس لئے کہ سنطور بجانے
اور اس کے سنو تاروں کو ملانے کے لئے جھکنا پڑتا ہے جو عمر کو پہنچے ہوئے افراد
کے لئے کمر میں جھکاو اور تھکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے رمضان جو پانچ
ساز بجاتے تھے (لیکن ان کے ساز بجانے کی تصدیق نہیں ہوئی ہے اور اسے ان
کے گھرانے کی زبان میں "پنچ ہتھیاری" کہتے ہیں۔ یعنی سنطور، کشمیری ستار،
مدہم (ہندستانی ستار) ساز اور طبلہ۔ صوفیانہ موسیقاروں میں پیش اندازی
کرنے والے فنکار عموماً خود سنطور بجاتے ہیں۔ کیونکہ اس کی آواز منڈلی میں
بجائے جانے والے سازوں سے اونچی ہوتی ہے۔[1] کشیری ستار میں بھی انہوں
نے آخری عمر میں چھوٹا سا ستار بجانا شروع کیا تھا جسے پیار سے "بلبل" کہا جاتا
ہے ایک شخص محمد خلیل، جو ان کی موسیقی کی محفلوں میں گانا سنتا تھا، کہا کرتا تھا
کہ رمضان جو کے ایسی محفلوں میں تشریف فرما ہونے سے ہی (چاہے وہ گانا بھی
نہ گائیں محفل کا رنگ دوبالا ہوتا ہے اور موسیقی کا سماں بندھ جاتا ہے۔

استاد رمضان جو کے شاید دو چار گانوں کے ریکارڈ ریڈیو کشمیر سرینگر کے
پاس موجود ہیں۔ یہ ان کے بڑھاپے کے زمانے کے گانے ہیں۔ ان میں ایک گانا مخمس
تال میں گایا گیا ہے جس کو اب decipher کرنے والا بھی کوئی نہیں
کسی کے اس تال میں گانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پہلے ہم صوفیانہ موسیقی کی محفلوں کا ایک خاکہ پیش کریں گے تاکہ قارئین

---

[1] یاد رہے مدہم بجاتے وقت بول "دھار" (ا) کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ صرف "دھا" ہی
کا کیونکہ "را" کی آواز سنطور کی آواز کو ہڑپ کرتی ہے۔

کو پتہ چلے کہ راگ رنگ کی یہ محفلیں کس نوعیت کی ہوا کرتی تھیں۔ رمضان جُو
نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صوفیانہ موسیقی کی ایسی ہی محفلوں میں گذارا ہے
جہاں سُننے والے زیادہ تر عشقِ الٰہی میں غرق رہتے تھے۔ ایسی محفلوں کا میر
مجلس کوئی مردِ درویش ہوتا تھا۔

غلام محمد ساز نواز نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد استاد رمضان جُو اور
اپنے چچا اُستاد صمد جو سے حاصل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ رمضان جو کا عکس
غلام محمد ساز نواز میں موجود ہے۔ اور اگر کسی شخص کو رمضان جُو کے گانے
کا انداز سمجھنے کی خواہش ہو تو وہ ساز نواز کے گلے اور اس کے ساز بجانے
سے رمضان جُو کے فن کا اندازہ لگا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود باپ
بیٹے کے انداز میں فرق ضرور ہوگا جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غلام محمد
ساز نواز کا بیان ہے کہ اُن کے آباو اجداد ایران سے آئے ہیں اور کشمیر میں آباد
ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اس جد کا نام حاتی (حبیت) جُو جتلاتے ہیں۔

شجرہ نسب یوں ہے:

حاتی تو

سلطان جو

قادر جو — وزیر جو — امر جو

وزیر جو:

رمضان جو — صمد جو — سُلطان جو

رمضان جو:

عبدالغنی — غلام محمد ساز نواز — غلام احمد
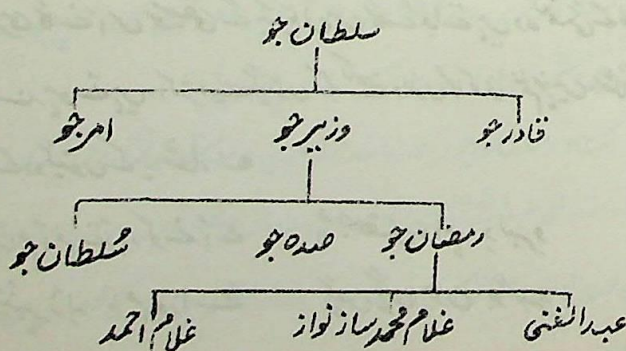
ایسے ہی ایک مردِ درویش (جس محفل میں رمضان جو گانے تھے) کے پاس ایک طائفہ آئی اور درویش سے کہا۔ مجھے تم سے عشق ہے اسلئے مجھے اپنے عقدِ نکاح میں لاؤ۔ درویش نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ وہ خود شادی شدہ تھا طائفہ نے کئی بار اُسے اس کیفیت سے آگاہ کیا اور اصرار کیا کہ تم میرے ساتھ شادی کرلو۔ آخر درویش بولا۔ "دیکھو اگر تم واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو گوسائیں کی طرح اپنے کانوں میں بڑی بڑی بالیاں پہنو۔ گوسائیں کی طرح بڑے منکے والی کئی مالائیں پہن لو۔ اور سُنو' اپنے بال بھی کٹواؤ۔ یعنی ٹنڈ منڈ۔"

طائفہ نے جب یہ بات سُنی تو کچھ دیر تامل کیا اور بولی۔ "میں گوسائیں کا روپ دھارن کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن سر کے بال نہیں کٹوا سکتی۔"

درویش نے اس کو شرطِ اوّل قرار دیا۔ لیکن طائفہ نے یہ شرط قبول نہ کی اور بالآخر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یاد رہے اُس زمانے میں صوفیانہ موسیقی کی محفلوں حافظ (رقاصہ) بھی ہوتی تھی جو ناچتی اور گاتی تھی۔ لیکن محفل میں حافظ کا ہونا لازمی شرط نہیں تھی۔ صوفیانہ موسیقی کی محفلوں میں فارسی اور کشمیری گانے گائے جاتے ہیں۔ اہلِ علم فارسی گانے سُن کر محظوظ ہوتے ہیں لیکن جو کشمیری گانے اس موسیقی کے سُر تال میں گائے جاتے ہیں وہ نغمگی کے لحاظ سے دلپسند ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے گیتوں کے لکھنے والوں کا کوئی علم نہیں۔ مثلاً مقام کلیان کے دو گیتوں کے یہ اشعار ؎

شام آم تے یار کونے آئے لا جھتس دامہ دِلبرو
ٹینبہ زلہ یام بوزا سے گیس گیس چون بوہبرو

روٗنبُل موسٔے تام پأریاے   لأجھٔمَس دامہٕ دِلبرو

(سہ تالہ) ۱۲ ماترہ

لو ییہَم عشقُن دامہ
دلآرامہٕ دِلبرو
ہی تنہٕ پیٚلیہ موہامہٕ
گٔیس گٔیس چانہ بوٗمبرو
ٹوٗپھ مودِ سیاہ فامہٕ
دلآرامہٕ دِلبرو

(دورویہ تال) ۱۴ ماترہ

یہ خالصتاً عاشقانہ گیت ہیں۔ لیکن صوفی ان سے عشق حقیقی کا پہلو تراشتے ہیں۔

مندرجہ ذیل قسم کے گیت بھی گائے جاتے ہیں ؎

بوبہٕ کرُ ھٔمَس سوٗرُ گژھ حوٗر   موہٕ ہیم دور ہا مَدنو
سارِسٕے ژھاجُھو کأشہ نو پوٗر   گنہٕ رُس تہٕندس حد کینہہ نو
یُس گومنہٕ کنہ تتھٕ لوٗب پوٗر (نوٗر)   موہٕ ہیم دور ہا مَدنو

(مقام آسادری۔ سہ تالہ)

صوفیانہ موسیقی کی محفلوں میں اُستاد کے ہمراہ سبھی ساز بجانے والے موسیقار گیت گاتے ہیں اور محفل میں شریک کچھ عام آدمی بھی (جنہیں روز روز ان محفلوں میں شمولیت کرنے سے گیت یاد رہتے ہیں)

اُستاد رمضان جو اپنے زمانے میں صوفیانہ موسیقی کے ممتاز ترین اُستاد مانے جاتے تھے۔ استاد محمد عبداللہ تبت بقال جو چند سال پہلے فوت ہوئے، اکثر رمضان جو کی فنی صلاحیتوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں ان کی محفلوں میں جاتا

اوران کے فن کے اسرار و رموز کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھنا۔ صوفیانہ موسیقی کے
اس وقت کے بزرگ موسیقار غلام محمد قالین بافت بھی اُستاد رمضان جو کو اعلیٰ
پایہ کا موسیقار تصوّر کرتے ہیں۔ انہوں نے خود ابتداء میں استاد رمضان جو کے
ایک بھائی سلطان جو سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔ رمضان جو اور ان کے گھرانے
کے بارے میں غلام محمد قالین بافت کے خیالات یہ ہیں :

"وزیر جو (رمضان جو کے والد) اپنے وقت کے اساتذۂ فن کے
ساتھ تیز کلامی کرتے تھے۔ مگر ساتھ ہی وسیع القلب تھے اور بلند اخلاق
کے مالک بھی۔ سنطور بجانے میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ یہ تین بھائی تھے
وزیر جو، امر جو اور قادر جو۔ امر جو کو طبلہ اور ستار بجانے میں مہارت
حاصل تھی۔ ان کے نشیب و فراز سے واقف تھے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر
محفلوں میں آتے۔ ان کے فن میں نزاکت نمایاں رنگ میں موجود تھی کبھی
کبھی صمد جو (رمضان جو کے بھائی) کے ہاتھ سے وصول (ڈھولکی جو طبلہ
سے پہلے صوفیانہ میں استعمال ہوتی تھی) چھین لیتے اور اُسے وصول کے
اسرار و رموز سکھاتے۔ اُسے کہا کرتے۔ "ستار بجانا میں نہیں جانتا لیکن
وصول بجانا جانتا ہوں۔ لہذا پورے دھیان سے سُنو"۔ قادر جو مدہم (ہندستانی
ستار) اور طبلہ بجاتے تھے۔ کشمیر کے مہاراجہ رام سنگھ کے ہاں ملازم تھے۔"

رمضان جو کی وابستگی درویشوں اور فقیروں سے تھی۔ ابتداء میں
شالہ مار (سرینگر) کے سجادہ نشین سیّد میرک شاہ کے مُرشد قدسہ صاحب
کے ساتھ دن رات گذارتے۔ یعنی ان کے حلقۂ اثر میں تھے۔ قدسہ صاحب

صوفیانہ موسیقی کی استھائی کا پہلا مصرعہ بُنیادی ڈھانچے کے اعتبار سے
دوسرے مصرعہ سے مختلف ہے استھائی میں چاہے آروہ ہو یا اوروہ کسی
نہ کسی قریبی سُر کو ترک کیا جاتا ہے، جسے ورجت سُر کہتے ہیں۔ یا اگر اس
سُر کی ضرورت محسوس ہو تو اسے ملا کر گایا بجایا جاتا ہے۔ اس طرح سے ورجت
سُر کی کراہٹ ختم ہو جاتی ہے۔ اور اُسے دوسرا سُر گھسیٹ کر اپنے اندر جذب
کرتا ہے جس سے دوسرے سُر کے مٹھاس میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی
کلاسیکی موسیقی کی تکنیکی بنیاد مضبوط ہے اور اس میں تنوع، رنگارنگی،
اور فنکاری ہے۔ صوفیانہ موسیقی میں اگرچہ مروجہ ہندوستانی طرز کے تان
پلٹے نہیں ہیں لیکن اس میں گانے وقت بازگشت کا انداز جُداگانہ ہے جس
کے گھماؤ پھراؤ سے فنکار کی چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ صوفیانہ موسیقی
کے تال لوک موسیقی کے تالوں سے جُدا ہیں۔ حالانکہ دادرا اور کہروا جیسے
تال بھی اس میں نظر آتے ہیں لیکن وہ باندازِ دگر پیش کئے جاتے ہیں (اس
پہلو کو اُجاگر کرنے کیلئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے) یہ تال ایرانی
ہیں، یونانی ہیں یا خالصتاً کشیریوں کی پیداوار - اس کی ابھی کوئی تحقیق نہیں
ہوئی ہے۔ اسی طرح سے یہ ابھی طے نہیں ہو پایا ہے کہ کیا کشیر کی صوفیانہ موسیقی
کو ہندوستانی موسیقی پر باعتبار عمر اولیت حاصل ہے یا ہندوستانی کلاسیکی
موسیقی کو اس پر۔ صوفیانہ موسیقی میں چند مقام ایسے بھی ہیں جنہیں ہندوستانی
ناموں سے پکارا جاتا ہے مثلاً آساوری، کلیان، جھنجوٹی، سارنگ، دیو
گندھار وغیرہ۔ لیکن جب ان کا ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے راگوں سے

نے اس کے گلے میں گوسائیں کی مالائیں اور کانوں میں بالے پہنائے تھے جب رمضان جو نے فقیری اختیار کی تو اس کے بھائی صدہ جو نے بھائی کی جدائی محسوس کی۔ وہ سجادہ نشین قدہ صاحب کے پاس گئے اور عرض کی کہ رمضان جو کے بغیر مجھے اپنے ذریعۂ معاش کی تلاش میں مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ کہا یہ میرا دست راست ہے اور آپ نے میرا یہی ہاتھ کاٹ کے رکھ دیا۔ مجھے اپنے بھائی کو واپس لینے کی اجازت دیجئے۔ قدہ صاحب نے اسے واپس جانے کی اجازت دی اور ساتھ ہی کہا کہ کشمیری ستار کی ان ہی دو تاروں میں (یاد رہے کشمیری ستار میں باج کے دو تار ہیں جنہیں بجایا جاتا ہے) تمہاری فقیری کا راز پوشیدہ ہے لیکن یہ مالائیں وغیرہ گلے سے نکال دو۔" سید مبارک شاہ فطرت (انہوں نے بھی صوفیانہ موسیقی کے فن کی تربیت حاصل کی تھی) کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ وزیر جو صاحب فن تھے۔ وہ یہ فن حافظاؤں (کشمیری رقاصاؤں) کو سکھاتے تھے۔ غلام محمد قالین بافت نے اُستاد رمضان جو کا ایک اور جگہ اس طرح ذکر کیا ہے "خضر اعمیٰ ایک صاحب فن تھے جو رمضان جو اور صدہ جو کے ہمسایہ ذاکر کے پاس رہائش پذیر تھے۔ یہ دونوں بھائی خضر اعمیٰ کو اپنے گھر بلاتے اور قہوہ پلاتے۔ پھر خضر اعمیٰ سے صوفیانہ موسیقی کے گانے سنتے اور وہ گانے سنانے کی فرمائش کرتے جن کا ان دو بھائیوں کو علم نہ تھا۔ رمضان جو کے گھرانے کے پاس جو پیچیدہ گیت مقام راست کشمیری کے ہیں وہ انہوں نے خضر اعمیٰ سے ہی سیکھے ہیں۔"

کشمیر کی صوفیانہ موسیقی ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے ہم پلہ ہے

موازنہ کیا جاتا ہے تو یہ آپس میں میل نہیں کھاتے ماسوائے چند باتوں کے۔
اس سلسلہ میں صوفیانہ موسیقی کے ایک نامور فنکار غلام محمد سازنواز کی
رائے یہ ہے کہ صوفیانہ موسیقی کو ہی ہندوستانی کلاسیکی موسیقی پر اولیت
حاصل ہے کیونکہ صوفیانہ موسیقی میں کوئی تغیر و تبدّل نہیں ہوا ہے یہ موسیقی
کسی قوم یا تہذیب کی عظمت رفتہ کی عکاس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے
گھرانے نے اس موسیقی کو اپنی اصلی ہیئت اور حالت میں محفوظ رکھا
ہے اور ہم سینہ بہ سینہ اسے نئی نسلوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ اُسی گھرانے
کا ایک عظیم فنکار اُستاد رمضان جو تھا۔ رمضان جو اس دنیائے فانی
سے ۹۰/۹۱ سال کی عمر میں اس صدی کی آٹھویں دہائی میں چل بسے۔

رمضان جو نے اپنے فن کا بیشتر حصّہ اپنے بیٹے غلام محمد سازنواز
کو سکھایا ہے۔ سازنواز نے یہ فن بچپن سے اپنے والد اور اپنے چچا اُستاد
صدہ جو سے سیکھا ہے۔ اس طرح سے سازنواز کے فن سے اُستاد رمضان جو
کے فن کا کچھ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ صوفیانہ
موسیقی کے گیت جن سُروں میں نغمہ بند ہیں اُن اُسی انداز سے گایا بجایا جاتا
ہے کسی موسیقار کو انہیں تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس
پابندی نے اگرچہ اس فن کی تخلیقی اُبھر ختم کر دی ہے لیکن اس کا
یہ فائدہ ہوا ہے کہ نہ صرف فن کے روایتی پیمانوں کو محفوظ کیا گیا ہے بلکہ اس
کے پرانے انداز کو بھی۔ غلام محمد سازنواز صوفیانہ موسیقی گاتے بجاتے وقت
اپنے والد رمضان جو کے انداز کو برابر قائم رکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ

نے اس کے گلے میں گوسائیں کی مالائیں اور کانوں میں بالے پہنائے تھے جب رمضان جو نے فقیری اختیار کی تو اس کے بھائی صدہ جو نے بھائی کی جدائی محسوس کی۔ وہ سجادہ نشین قدہ صاحب کے پاس گئے اور عرض کی کہ رمضان جو کے بغیر مجھے اپنے ذریعۂ معاش کی تلاش میں مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ کہا یہ میرا دست راست ہے اور آپنے میرا یہی ہاتھ کاٹ کے رکھ دیا۔ مجھے اپنے بھائی کو واپس لینے کی اجازت دیجئے۔ قدہ صاحب نے اسے واپس جانے کی اجازت دی۔ اور ساتھ ہی کہا کہ کشمیری ستار کی ان ہی دو تاروں میں (یاد رہے کشمیری ستار میں باج کے دو تار ہیں جنہیں بجایا جاتا ہے) تمہاری فقیری کا راز پوشیدہ ہے لیکن یہ مالائیں وغیرہ گلے سے نکال دو۔" سید مبارک شاہ فطرت (انہوں نے بھی صوفیانہ موسیقی کے فن کی تربیت حاصل کی تھی) کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ وزیر جو صاحب فن تھے۔ وہ یہ فن حافظاؤں (کشمیری رفاصاؤں) کو سکھاتے تھے۔ غلام محمد قالین بافت نے استاد رمضان جو کا ایک اور جگہ اس طرح ذکر کیا ہے "خضر اعمیٰ ایک صاحب فن تھے جو رمضان جو اور صدہ جو کے ہمسایہ ذاکر کے پاس رہائش پذیر تھے۔ یہ دونوں بھائی خضر اعمیٰ کو اپنے گھر بلاتے اور قہوہ پلاتے۔ پھر خضر اعمیٰ سے صوفیانہ موسیقی کے گانے سنتے اور وہ گانے سنانے کی فرمائش کرتے جن کا ان دو بھائیوں کو علم نہ تھا۔ رمضان جو کے گھرانے کے پاس جو پیچیدہ گیت مقام راست کشمیری کے ہیں وہ انہوں نے خضر اعمیٰ سے ہی سیکھے ہیں۔"

کشمیر کی صوفیانہ موسیقی ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے ہم پلہ ہے

موازنہ کیا جاتا ہے تو یہ آپس میں میل نہیں کھاتے ماسوائے چند باتوں کے۔
اس سلسلہ میں صوفیانہ موسیقی کے ایک نامور فنکار غلام محمد ساز نواز کی
رائے یہ ہے کہ صوفیانہ موسیقی کو ہی ہندوستانی کلاسیکی موسیقی پر اولیت
حاصل ہے کیونکہ صوفیانہ موسیقی میں کوئی تغیر و تبدّل نہیں ہوا ہے یہ موسیقی
کسی قوم یا تہذیب کی عظمت رفتہ کی عکاس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے
گھرانے نے اس موسیقی کو اپنی اصلی ہیئت اور حالت میں محفوظ رکھا
ہے اور ہم سینہ بہ سینہ اسے نئی نسلوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ اُسی گھرانے
کا ایک عظیم فنکار اُستاد رمضان جو تھا۔ رمضان جو اس دنیائے فانی
سے ۹۰/۹۱ سال کی عمر میں اس صدی کی آٹھویں دہائی میں چل بسے۔

رمضان جُو نے اپنے فن کا بیشتر حصّہ اپنے بیٹے غلام محمد ساز نواز
کو سکھایا ہے۔ ساز نواز نے یہ فن بچپن سے اپنے والد اور اپنے چچا اُستاد
صدہ جو سے سیکھا ہے۔ اس طرح سے ساز نواز کے فن سے اُستاد رمضان جو
کے فن کا کچھ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ صوفیانہ
موسیقی کے گیت جن سُروں میں نغمہ بند ہیں اُن اُسی انداز سے گایا بجایا جاتا
ہے کسی موسیقار کو انہیں تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس
پابندی نے اگرچہ اس فن کی تخلیقی اُبھر ختم کر دی ہے لیکن اس کا
یہ فائدہ ہوا ہے کہ نہ صرف فن کے روایتی پیمانوں کو محفوظ کیا گیا ہے بلکہ اس
کے پرانے انداز کو بھی۔ غلام محمد ساز نواز صوفیانہ موسیقی گاتے بجاتے وقت
اپنے والد رمضان جو کے انداز کو برابر قائم رکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ

رمضان جو مجھے لے کو کنٹرول میں رکھنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ اسے وہ
اپنی زبان میں "لنگر" کہتے ہیں۔ اگر ان کی منڈلی کا کوئی فنکار تیز روی کا
رجحان ظاہر کرے تو وہ اس سے کہتا ہے۔ "لنگر رٹو"، یعنی تیز مت بجاؤ۔
ساز بجاتے وقت ساز کی تیزی کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا کیونکہ اس
سے گانے کی طرف توجہ ختم ہو جاتی ہے اور گانے اور بجانے کا توازن بگڑ
جاتا ہے۔ یاد رہے صوفیانہ موسیقار خود ہی گاتے بھی ہیں اور بجاتے بھی ہیں۔
غلام محمد ساز نواز کا کہنا ہے کہ رمضان جو گانا شروع کرتے وقت چند منٹوں
تک آہستہ آہستہ سنطور بجاتے تھے۔ یعنی قلم (مضراب) سے تاروں پر
اوگن ضربیں لگاتے تھے اور پھر جب لے بنتی تھی اور ایک سماں بندھ
جاتا تھا تو دوگن، چوگن جو چاہے کرتے تھے لیکن خیال یہی رہتا تھا کہ لے
پر گرفت برقرار رہے اور گانے میں رکاوٹ نہ پڑنے پائے۔ کشمیری ستار
بجاتے وقت بھی وہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ جہاں تک کشمیری
ستار کا تعلق ہے یہ پیندھے کا ساز نہیں۔ اس کی ڈنڈی پتلی ہے اور اس
کے چندھ اوپر نیچے دھاگے کے ہیں۔ سب تار لوہے کے ہیں ماسوائے ایک تار
کے جو تانبے کا ہے اور اسے پنچم کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ باقی تاروں کو "سا" کے
ساتھ۔ البتہ تمبے کے ساتھ لگی کھونٹی کا تار، تار سپتک کے تار سے ملایا جاتا
ہے لیکن اس کا استعمال چکاری وغیرہ کی طرح نہیں کیا جاتا۔ غلام محمد
ساز نواز کبھی کبھار اس تار کو تھوڑا سا مضراب دیتے ہیں۔ تاہم کشمیری
ستار کے سُروں پر اُنگلی سے معمولی سی کھینچا تانی کرتے وقت مدھر آواز

پیدا ہوتی ہے جو ریڈیو پر زیادہ اونچی اور پُرکشش سُنائی دیتی ہے۔

اُستاد رمضان جو نیم دور تال سے واقف تھے۔ چنانچہ اُن کا بیٹا غلام محمد ساز نواز اس وقت صوفیانہ موسیقی کی محفلوں میں وقت دستیاب ہونے پر نیم دور تال میں گانا گاتا ہے۔ ساز نواز کا دعویٰ ہے کہ اب ان کے گھرانے کے بغیر اس تال میں کوئی اور موسیقار گانا نہیں گا سکتا[1]۔ اس تال میں لفظ کا تانا بانا اس طرح بکھر جاتا ہے جیسے یہ حرفوں میں تقسیم ہوا ہو اور ایک ایک لفظ چار چار آٹھ آٹھ ماتراؤں پر گذر کر پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود گیت سُننے والے پر اس تال کی چال گراں نہیں گذرتی۔ نیم دور تال ۲۴ ماترہ پر محیط ہے۔ ساز نواز کا کہنا ہے کہ اس تال کو گاتے وقت ۳ سپرد سم دکھانے پڑتے ہیں۔ استاد محمد عبداللہ تبت بقال بھی اس تال سے واقف نہیں تھے۔ غلام محمد ساز نواز یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ نیم ثقیل تال کے کچھ گانے بھی اُن کے گھرانے کے پاس موجود ہیں۔ یہ تال اب ناپید ہے۔ آخر پر ملاحظہ ہو حد ابندی" تال نیم دور" کے ایک حصہ کی۔

---

[1] اُستاد رمضان جو کی موت کے ساتھ ہی صوفیانہ موسیقی کے کچھ مقامات بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُٹھ گئے کیونکہ وہی اُن کے واحد گایک تھے۔ اُن کے شاندار مرتبے کے اعتراف کے طور پر کلچرل اکیڈیمی نے انہیں خلعت فاخرہ سے نوازا۔ ایسا کر کے اکیڈیمی نے خود اپنی عزت افزائی کی۔ لیکن اس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا کہ قومی سطح پر انہیں کسی اعزاز کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔ (ایڈیٹر)

۵ اُچھ لو سم وَتہٖ وچھان   جوپہٖ پیچہ مو رَتے

	۱ ×	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹ ۲	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳ ۰	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷ ۳	۱۸	۱۹	۲۰ ۴	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴
۱																سا	ما	سا	ما	گا	گا	گا	ما	پا
																اُچھ	لو	-	-	-	-	-	-	لو
۲	دھا	نی	نی	دھا	پا	دھا	پا	ما	گا	گا	پا	ما گا	رے	رے	پا	ما	ما	گا	گا	گا	رے	رے	رے	رے
	سم	-	-	-	ہ	ہ	ہ	لو	سم	-	لو	-	سم	-	ہ	ہَ	وَن	-	-	-	-	-	-	-
۳	رے	گا	گا	رے	رے	رے	سا	سا	رے	رے	رے	سا	ما	پا	پا	پا	ما	ما	ما	ما	پا	پا	پا	پا
	ہ	ہ	-	-												اُچھ	لو	-	-	-	-	-	-	لو
۴	دھا	نی	نی	دھا	پا	دھا	پا	ما	گا	گا	ما	گا	گا	گا	گا	پا	دھا	دھا	دھا	دھا	نی	سا	سا	سا
	سم	-	-	-	ہ	ہ	ہ	لو	سم	-	لو	-	سم	-	-	وتہٖ	لوٗ	-	-	-	-	-	-	وٗ

۵	نی	دھا	پا	پا	پا	دھا	پا	ما	دھا	دھا	دھا	پا	پا	پا	دھا	پا	ما	ما	ما	ما	گا	گا	ما	پا
	چھا	-	-	ن	-	-	-	-	ۂ	ۂ	ۂ	ۂ	-	-	اُچھ	میہ	لو	-	-	-	-	-	-	لو
۶	دھا	دھا	دھا	دھا	پا	دھا	پا	ما	گا	گا	پا	ما گا	رے	رے	پا	پا	دھا	دھا	نی	سا	سا	سا	سا	سا
	سم	-	-	-	ۂ	ۂ	ۂ	لو	سم	-	لو	-	سم	-	-	ونۂ	وُ	-	-	-	-	-	-	وُ
۷	پا	پا	پا	پا	پا	پا	پا	پا	دھا	دھا	دھا	دھا	پا	پا	پا	پا	سا	سا	سا	سا	دھا	دھا	دھا	دھا
	چھا	-	-	-	-	-	-	وُ	چھا	-	-	-	ن	-	جو	ہ	پنج	-	-	-	پچھم	-	-	رٗ

نشاط انصاری

ثناء اللہ رباب نواز

دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی کہ میں بارہمولہ کے نیشنل ہائی اسکول کے مڈل ڈیپارٹمنٹ میں زیر تعلیم تھا اور یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ سانولے رنگ کے ایک خوش پوش، خوش وضع، دراز قد اور چوڑے چکلے ہاڑ والے رباب نواز اپنی ہی طرح کا سجا سجایا رباب کندھے پہ لٹکائے ہمارے گاؤں دلنہ میں اکثر و بیشتر آیا کرتے تھے۔ چابی چھاپ سفید لٹھے کے اُجلے اُجلے قمیض اور پائجامے اور کسی دوسرے رنگ کے واسکٹ میں ملبوس اور پاؤں میں زری جوتی ڈالے وہ جونہی ہمارے محلے میں قدم رکھتے تو سب سے پہلے راقم کے بڑے بھائی تنہا انصاری مرحوم کے پاس آداب بجا لانے کی نیت سے آجاتے تھے اس لئے کہ تنہا مرحوم جہاں ساز و آواز کے شیدائی تھے، وہاں وہ موسیقاروں کے زبردست قدردان اور مداح بھی تھے۔ مرحوم اس فن کار کی خاطر تواضع کرنے میں کوئی کمی نہ رکھتے تھے۔

ریشمی یا مخملی غلاف میں رکھے ہوئے رباب کو جب بجانے کے لئے وہ باہر نکال کر بائیں ہاتھ سے تھام کر اپنے دائیں ہاتھ کی محرابی انگلیوں میں رکھے ہوئے مضراب سے اسکے تاروں پر ضرب لگانا شروع کرتے تو فردوسِ گوش اور ترنم ریز لہریں ہوا میں تحلیل

ہوکر سامعین کے کانوں میں رس گھولنے لگتی تھیں۔ ان کی مسحور کن آواز میں ایک خاص قسم کا جادو اور کشش تھی اور اپنے منفرد آہنگ اور نرالے انداز کے اُتار چڑھاؤ سے سننے والوں کو سازو آواز کی ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتے تھے۔ ہندوستان کی شہرۂ آفاق گلوکار لتا منگیشکر نے پاکستان کے مایہ ناز کلاسیکل موسیقار مہدی حسن کے مخصوص فن سے متاثر ہوکر ایک بار کہا تھا کہ ان کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے اس رباب نواز کے گلے سے بھی بھگوان ہی بولتا تھا۔

رباب کی تاروں کو مضراب سے چھیڑ چھیڑ کر اثر آفریں اور دلکش نغمے پیدا کر کے رنگ و رامش کے منظر پیش کرنا ان کے فن کا کمال تھا۔ اسی وجہ سے انہیں قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور ہر محفل میں وہ اپنے مخصوص فن کا رنگ دکھلا کر رنگ جمانے میں ایک ماہر فن کار مانے جاتے تھے۔ رباب تو دوسرے فن کار بھی بجایا کرتے تھے لیکن جس رباب نوازگی میں بات کر رہا ہوں وہ اپنے رباب کی تاروں میں جان ڈال کر ان کو زبان عطا کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔

میں اس زمانے میں اس قدر کم فہم تھا کہ نہ تو مجھے اس رباب نواز کے نام کی واقفیت تھی اور نہ ہی یہ جانتا تھا کہ وہ کس جگہ سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن کچھ وقت گذرنے کے بعد جب میرا شعور اس رباب نواز کے مخصوص فن اور اس کے سازو آواز کی طرف قدرے منعطف ہوا تو میں جان چکا کہ وہ شخص ہمارے یہاں کے کھلیانوں اور گاؤں گاؤں پھرنے والے میراثیوں کی طرح کا کوئی عام گویا نہیں بلکہ وادی کا ایک اچھا اور منجھا ہوا رباب نواز ہے اور گلوکار بھی۔ میرا مطلب ہے ثنا اللہ بٹ۔ عام لوگوں میں ثنا اللہ "ثنہ بالہ" کے نام سے ہی جانے جاتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ "بالہ" لفظ ان کے خاندان کا

یا تو عرف ہو یا ایک قسم کی تحقیر یا کجی ۔ آج کل بھی یہ لفظ ان کے خاندان کے ہر فرد کے نام کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

ثنا اللہ بٹ کا چھوٹا بھائی گگہ بالہ (غلام محمد بٹ) بھی اپنے ہی بھائی کی طرح ایک اچھا خاصا رباب نواز تھا لیکن سازو آواز کے امتزاج کا جو آہنگ ثنا اللہ بٹ کے فن میں پایا جاتا تھا وہ بات اس کے بھائی غلام محمد بٹ میں نہ تھی۔ دوسرا واضح فرق اُن دو بھائیوں کے چہروں کی رنگت کا تھا۔ ثنا اللہ جہاں ایک وجیہہ اور خوبرو رباب نواز تھے وہاں ان کا چھوٹا بھائی غلام محمد قدرے زشت رو قسم کا فن کار تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے بے شمار داغوں کے نشان تھے۔ مگر اپنے بھائی ہی کی طرح وہ بھی ہمیشہ خوش پوش نظر آتا تھا اور اس کے علاوہ خوش وضع اور خوش گفتار بھی تھا۔ اور ان دونوں بھائیوں کی روزی روٹی کا اہم ذریعہ یہی رباب بجانا تھا۔

ثنا اللہ بٹ کا آبائی مسکن کریری تھا اور کریری کا یہ قصبہ نما گاؤں بارہمولہ تحصیل کے کروہن علاقہ کے ایک سطح مرتفع پر واقع ہے جس کے مشرق میں راجہ پرتاپ دت در لبکا" کے ہاتھوں بسایا ہوا تاریخی گاؤں تاپر آباد ہے اور مغرب میں وترگام (واگورہ) جنوب میں کلہن کے زمانے کا تیل گرام اور آج کل کا تلگام واقع ہے اور شمال میں ٹھنڈمہ نام کا ایک چھوٹا سا غیر معروف گاؤں۔ کریری وہی سرزمین ہے جو دو کشمیری رزمیہ مثنویوں "سام نامہ" اور "خاور نامہ" کے تخلیق کار سید امیر شاہ (کریری)، مشہور نعت نگار سید ثنا اللہ ثنا (کریری)، جنگ مختار نام کی مثنوی کے مصنف سید مظفر شاہ، محتشم کاشی کے فارسی روضۃ الشہداء کے مترجم سید معقول شاہ اور ایک ہم عصر کشمیری شاعر سید عبدالجبار خاموشی (کریری) کی جنم بھومی ہے۔ اس گاؤں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ سادات کریری کے مورثِ اعلیٰ سید مراد بخاری کی مرجعِ خلائق زیارت اور خانقاہ اسی گاؤں کے وسط میں واقع ہے۔ تاریخی کتب کے مطالعہ

سے معلوم ہوتا ہے کہ سید مراد بخاری کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسین علیہ السلام سے جا
ملتا ہے اور حضرت حسینؓ کے بعد سید مراد بخاری اسی شاخ کی اکیسویں پیڑھی کے ایک
صوفی صافی بزرگ اور اہل اللہ تھے۔

کریری کے اسی گاؤں میں تین طبقوں کے لوگ لگ بھگ آٹھویں صدی ہجری
سے آباد ہیں۔ ایک طبقہ ہے سادات کا، دوسرا زمینداروں کا اور تیسرا میراثی (گویوں)
کا، جن کو عرف عام میں "شہیر" کہا جاتا ہے۔ "شہیر" اصل میں عربی زبان کا لفظ ہے،
جس کے معنی ہیں مشہور۔ لیکن کشمیری زبان میں یہ لفظ ان ہی لوگوں کے لئے وضع
کیا جا چکا ہے جن کا پیشہ گانا بجانا ہو اور جو گاؤں گاؤں جا کر گانا بجا کر اپنا معاش
پیدا کرتے ہوں۔ موخر الذکر طبقے میں ایک رباب نواز محتہ بٹ نام کا ہو گزرا ہے۔ اس
کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ شیب و تیب قسم کا شخص تھا اور اسی کا بڑا
بیٹا ثناءاللہ بٹ رباب نواز ہے۔ محتہ بٹ کا باپ خالق بٹ بھی اسی پیشہ سے منسلک
بتایا جاتا ہے۔

ثناءاللہ بٹ کے بڑے فرزند غلام قادر بٹ، جو خود بھی آج کل ریڈیو کشمیر کے شعبۂ
موسیقی میں رباب نواز کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، کا کہنا ہے کہ ان کے والد کی
تاریخ پیدائش یوں تو کہیں پر بھی درج نہیں۔ کیونکہ وہ بالکل اَن پڑھ تھے۔ البتہ
جب انہوں نے ۱۹۷۲ء میں انتقال کیا تو اس وقت ان کی عمر ستر برس کے
قریب تھی۔ اس لحاظ سے ثناءاللہ کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۲ء کے آس پاس ہو سکتی
ہے۔ رباب بجانے کا فن انہوں نے یوں تو وراثت میں پا لیا تھا لیکن انہوں
نے اپنے والد محتہ بٹ ہی سے رباب بجانے کی تربیت حاصل کی تھی۔
چالیس پینتالیس سال تک ثناءاللہ اپنے فن کا مظاہرہ کھلی جگہوں پر کرتے
رہے اور اس میدان میں انہوں نے اپنی اُپج سے ہی اپنا مقام بنا لیا تھا لیکن تقسیم

ٹک کے بعد ۱۹۴۸ء کے دوران جب سرینگر میں ریڈیو سٹیشن کا قیام عمل میں آیا تو ایک رباب نواز کی حیثیت سے ان کا تقرر وہاں ہوا۔ اس ادارے میں ثناءاللہ کو جناب قیصر قلندر، موہن لال ایمہ اور موہن لال چھوٹو ایسے میوزک کمپوزروں اور راگ راگنیاں جاننے والے آرٹسٹوں کی صحبت میں کام کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ اس صحبت سے ان کا فن نکھر آیا اور جب انہوں نے ریڈیو کشمیر میں آکر اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تو انہیں اے کلاس آرٹسٹ کا درجہ دیا گیا۔

رباب بجانے سے قطع نظر ثناءاللہ کو ریڈیو کشمیر میں آکر سازِ کشمیری، سارنگی، ہارمونیم اور طبلہ بجانے کی مہارت بھی حاصل ہوئی۔ ریڈیو کشمیر کی صوفیانہ موسیقی کی محفلوں میں ثناءاللہ، غلام محمد قالین بافت اور مرحوم استاد محمد عبداللہ تبت بقال، کے ساتھ طبلہ بجایا کرتے تھے اور بعض اوقات چھکری پروگراموں میں رباب بجانے کے علاوہ مرکزی گلوکاروں کے ساتھ خود بھی گایا کرتے تھے۔ لیکن عام طور پر وہ ریڈیو کشمیر میں صرف رباب بجانے کے ہی کام پر مامور تھے۔ ویسے بھی لائٹ اور کلاسیکی موسیقی میں عام طور پر یہی قاعدہ ہوتا ہے کہ ساز بجانے والے اپنے سازوں کے طفیل میوزک کمپوزروں کی دھنوں اور راگ راگنیوں کا ساتھ دے کر خود تو خاموش رہتے ہیں۔ سولو، کلاسیکل اور لائٹ میوزک کی دھنوں پر حاوی ہونے کا ملکہ انہوں نے ریڈیو کشمیر میں آکر ہی میوزک کمپوزروں کی مناسب تربیت سے پالیا تھا۔ اور نوا، اساوری اور اوزال ایسے مقامات پر فنی دسترس رکھنے کا شعور بھی ان کو وہاں ہی ملا تھا۔ ریڈیو کشمیر میں آکر جن گلوکاروں کے ساتھ مل کر ثناءاللہ رباب بجانے کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے ان میں راج بیگم، نسیم اختر، غلام حسن صوفی، غلام محمد راہ، غلام محمد میر اور علی محمد لشتر قابل ذکر ہیں۔

وادی سے باہر ثناءاللہ بٹ نے مختلف کلچرل ٹروپوں میں شرکت کر کے دہلی،

بمبئی، لکھنؤ اور کلکتہ کے شہروں میں جاکر اپنی رباب نوازی کا مظاہرہ کر کے دھاک بٹھادی۔ ریڈیو کشمیر کے سٹیڈیو سے باہر جہاں کہیں اس ادارے کی طرف سے راگ ورنگ کی محفلیں سجائی جاتی تھیں تو ثناء اللہ رباب بجانے کے فن سے اپنے شیدائیوں کو محظوظ کر کے ان سے داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ثناء اللہ فشار الدم (بلڈ پریشر) کے مرض میں مبتلا تھے اور اسی عارضہ کی وجہ سے سنہ ۱۹۶۵ء کے دوران اُن پر اچانک فالج گرا اور ۹ سال تک اپنی کٹیا واقع کریری میں موت و حیات کی کشمکش میں پڑے رہے۔ ان کے بیٹے غلام قادر بٹ کا کہنا ہے کہ ریڈیو کشمیر کے ارباب بست وکشاد نے نہ تو جیتے جی اپنے اس عظیم رباب نواز کی حوصلہ افزائی کی اور بھولے سے کریری آکر ان کی عیادت کو آنا تو کیا ان کا نام تک بھی نہیں لیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے اس اے کلاس آرٹسٹ کی بیماری کے دوران کوئی مالی معاونت بھی نہ کی گئی۔ حالانکہ ریڈیو کشمیر کو حسن خدمت کے طور ان کی شکستہ حال فیملی کو باضابطہ ماہانہ پنشن رکھنی چاہیئے تھی۔ بھلا ہو ریاستی کلچرل اکادمی کا جس کے صاحب درد اور سینے میں دل رکھنے والے سربراہ جناب محمد یوسف ٹینگ نے اس رباب نواز کے بیٹے کے حق میں بارہ سو روپے کا سالانہ مالی ایڈ منظور کروا کے اپنی فن پروری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ مالی امداد اس کے بیٹے کو آج بھی مل رہی ہے۔

ہماری وادیٔ گل پوش کے یہ رباب نواز برابر ۹ سال بستر مرگ پر پڑے رہنے کے بعد آخر کار سنہ ۱۹۷۴ء کو اس دارِ فانی سے اٹھ کر چلے گئے اور اپنے پیچھے جہاں پسماندگان میں دو لڑکیاں (راجہ اور خدیجہ) پانچ بیٹے (غلام قادر بٹ، عبدالعزیز بٹ، غلام علی بٹ، عبدالحمید بٹ، نظیر احمد بٹ) اور بیوہ چھوڑ گئے وہاں اپنے رباب کی تاروں میں سموئے ہوئے فردوس گوش نغمے اور وجد آفریں دھنیں بھی اپنے پیچھے متاعِ حیات کے طور چھوڑ گئے ؎

اس ایک شخص میں تھیں دل ربائیاں کیا کیا ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص!

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر